ہفت روزہ

ندائے خلافت

۱۱ اپریل ۱۹۹۴ء

☆ پاکستان دوراہے پر ------ ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک اہم خطابِ جمعہ

☆ ہمارے ایٹمی پروگرام کے مضمرات ---- ایک قابل توجہ نقطۂ نظر

☆ "کشمیر اور پاکستان" کے موضوع پر تحریکِ خلافت کا مذاکرہ

حدیث امروز

ملک خداداد پاکستان کی نظریاتی شناخت

اے ہموطنو' سنتے ہو کیا اہل بصیرت کہتے ہیں! تمہارا وطن جو اپنی ہیئت ترکیبی کے اعتبار سے دنیا بھر میں ممتاز تھا' اب اپنی نظریاتی شناخت کھو بیٹھا ہے۔ جیسے خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمیؐ' بالکل ویسے ہی یہ ملک خداداد بھی اپنی ساخت و شناخت میں منفرد تھا لیکن اپنوں کی مجرمانہ غفلت اور غیروں کی عیارانہ ملی بھگت نے اسے جنوب ایشیا کے چھوٹے بڑے' اہم و غیر اہم "ممالک" میں سے ایک بنا کر رکھ دیا ہے۔ جن میں نیپال بھی ایک ملک ہے' بھوٹان بھی ایک ملک اور سری لنکا تو وہ ملک ہے جس سے نکلنے والے ایک زمانے میں سب باون گزے ہوتے تھے۔ اپنے گھر میں ہم "پدرم سلطان بود" کے زعم میں مبتلا رہیں تو ان لوگوں کو اس پر کوئی اعتراض نہیں' ہماری قسمت جن کے ہاتھوں میں ہے کیونکہ وہاں حساب کتاب کا اربعہ مرتب کرتے اور میکیاولی سیاست کے نقشے بناتے ہوئے ہماری اصل حیثیت کا یقین کرنا انہی چاکیوں کے اختیار میں ہے۔ تھوڑا عرصہ پہلے ہم "فرنٹ لائن سٹیٹ" تھے' اب مسائل کی ایک پوٹ ہیں۔ پہلے ہمارے ناز اٹھائے جاتے تھے' اب ہر حرکت پر سرزنش کی جاتی ہے۔ یہ تو باہر سے دکھائی دینے والا منظر ہے' درون خانہ ہمارے مشاغل بھی کس سے پوشیدہ ہیں۔ ہماری بساط سیاست پر جو شطرنج کھیلی جا رہی ہے وہ کسی قاعدے اور ضابطے کی پابند نہیں' ایوانہائے نمائندگان میں اول تو ہمارے منتخب نمائندے جا کر بیٹھنا کسر شان سمجھتے ہیں اگر کبھی ادھر کی سیر پر طبیعت آ ہی جائے تو یہاں وہ تماشے دکھاتے ہیں کہ ٹیلی ویژن کو اپنے کیمروں کی آنکھوں پر ہاتھ رکھنے پڑ جاتے ہیں' رہنمایان قوم جلسوں میں اپنے عوام کی تفریح طبع کے لئے الٹے لٹکنے پر بھی تیار ہیں' ایسی زبان بولتے ہیں کہ نطق بو سے لینے لگے' منہ سے ذو معنی جملوں کے وہ پھول جھڑتے ہیں جن کی "خوشبو کے بھبکے" جگت بازوں کی بھی ہوش گم کر دیں۔ دوسری طرف سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے' بوسنیا کے غم میں ہم نڈھال ہیں اور کشمیری بھائیوں کو جو زخم لگ رہے ہیں ان کے درد کی ٹیس ہمارے بدن میں اٹھتی ہے۔ جان ناتواں پر کوئی ایک بوجھ ہو تو بیان کیا جائے۔ ایسے میں دارالخلافہ اسلام آباد اور دارالحکومت لاہور میں پانچ پانچ چھ چھ گھنٹوں جاری رہنے والے عوامی ثقافتی میلے منعقد نہ کئے جاتے اور حکومتوں کے اعلیٰ ترین زعماء بنفس نفیس ان کی رونق نہ بڑھاتے تو اس درد کا --- عارضی سہی --- درماں کیسے ہوتا جو ہمیں شب و روز بے چین رکھتا ہے۔ مہنگائی نے جینا دوبھر کر دیا ہے' امن و امان کی مخدوش حالت خطرے کے نشان کو عبور کر گئی ہے اور آبادی کے مختلف طبقات میں باہمی عداوت و دشمنی کے اژدھے پھنکار رہے ہیں تو ان عوارض کا بھی ایک ہی تیر بہدف صدری نسخہ ہمارے پاس ہے' دمادم مست قلندر! یہ بھی ہونے ہی والا ہے' انتظار کی زحمت زیادہ کھینچنی نہ پڑے گی۔ یہ تماشا دکھائے گا کیا سین' پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ۔

عذاب ہم پر تلا کھڑا ہے لیکن ایسے میں بھی ایک مثال گھپ اندھیرے میں روشنی کی کرن بن کر ایک راستہ ہمیں دکھا رہی ہے۔ قوم یونسؑ نے سر پر آئے عذاب کو اللہ کی جناب میں اجتماعی توبہ کے ذریعے ٹال دیا تھا۔ یہ قصہ قرآن حکیم نے ہمیں داستان سرائی کے لئے نہیں سنایا بلکہ قیامت تک کے لئے امید کی ایک شمع جلا کر قوموں کی منڈیر پر رکھ دی تھی' سو کوئی ہے جو اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے اٹھے اور قوم کو رجوع الی اللہ کی دعوت کا کام زور شور سے شروع کر دے۔ ہماری نجات کا راستہ بس یہی ایک ہے۔○

قیمت ۵ روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الہدیٰ

جائز کیا گیا ہے تمہارے لئے روزے کی راتوں میں اپنی بیویوں سے بے حجاب ہونا

(کہ روزے کی فرضیت اور اس کی حکمت کے جامع بیان اور قرآن حکیم کے ساتھ ماہ رمضان کے خصوصی تعلق کو نمایاں کرنے اور پھر روزے اور دعا کے باہمی تعلق کو واضح کرنے کے بعد اب ایک آیت میں' جو خاصی طویل ہے' روزے کے احکام و آداب کا نہایت جامعیت کے ساتھ احاطہ کیا گیا ہے۔ سابقہ شریعت میں روزے کے احکامات نسبتاً سخت تھے۔ یہود کے ہاں افطار کے فوراً بعد روزہ پھر شروع ہو جاتا تھا اور روزے سے متعلق تمام پابندیاں شب میں بھی برقرار رہتی تھیں۔ شریعت محمدیؐ میں یہ خصوصی نرمی کی گئی کہ رات کے اوقات کو روزے کی پابندیوں سے آزاد کر دیا گیا کہ رات کے وقت جس طرح کھانے پینے پر کوئی بندش نہیں ہے اسی طرح میاں بیوی کے باہمی تعلق پر بھی کوئی قدغن نہیں ہے)

وہ تمہارے لئے بمنزلہ لباس ہیں اور تم ان کے لئے بمنزلہ لباس ہو

(کہ میاں اور بیوی آپس میں جس نوع کی وابستگی رکھتے ہیں اس لئے لباس کا استعارہ ایک نہایت بلیغ استعارہ ہے۔ ان دونوں کے درمیان چولی دامن کا رشتہ ہے۔ ہمارے دین نے' جو دین فطرت ہے' ان کے باہمی تعلق پر اگر خاص خاص حالات میں کوئی محدود قسم کی پابندی عائد کی بھی ہے تو صرف تربیت و تزکیہ نفس کی ضرورت کی حد تک ہے' اس سے متجاوز کوئی بندش ان پر نہیں لگائی گئی)

اللہ نے دیکھا کہ تم خیانت کر رہے تھے اپنے آپ سے تو اس نے تم پر عنایت کی اور تم سے درگزر فرمایا تو اب تم ان سے ملو اور جو کچھ اللہ نے تمہارے لئے مقدر کر رکھا ہے اس کے طالب بنو۔

(سورۃ البقرہ آیت ۱۸۷)

(اس حکم کے نازل ہونے سے پہلے جبکہ اس معاملے میں اشتباہ موجود تھا' اگر کوئی یہ سمجھتے ہوئے کہ روزے کی راتوں میں بھی میاں بیوی کے تعلقات پر پابندی ہے' اس کے باوجود اس چیز کا مرتکب ہوتا رہا تو گویا وہ ایک درجے میں اپنے نفس کے ساتھ خیانت کا ارتکاب کرتا رہا۔ اللہ تعالیٰ نے کمال شفقت و عنایت کے ساتھ ایسی تمام تقصیرات کی معافی کا اعلان فرما دیا اور واضح الفاظ میں بیویوں سے ملاقات کی اجازت دے دی' اس صراحت کے ساتھ کہ یہ ازدواجی تعلق دراصل اولاد کے حصول کا ذریعہ ہے' جس کا تمام تر انحصار تقدیر الٰہی پر ہے' اور تعلق زن و شو میں اصلاً یہی مقصد پیش نظر رہنا چاہئے)

اور کھاؤ اور پیو یہاں تک صبح کی سفید دھاری تم پر واضح ہو جائے شب کی سیاہ دھاری سے۔ پھر پورا کرو روزے کو رات تک۔

حافظ عاکف سعید

(کہ صبح صادق کے اچھی طرح نمایاں ہونے تک کھانے پینے کی مکمل آزادی ہے' اس آزادی سے فائدہ اٹھانا منشائے شریعت ہے' یہی وجہ ہے کہ احادیث مبارکہ میں سحری کرنے کی خصوصی تاکید آئی ہے کہ اسی سے ہمارے اور یہود کے روزے کے مابین امتیاز قائم ہوتا ہے۔ ہاں صبح صادق کے ساتھ ہی روزہ اور اس کی پابندیوں کا آغاز ہو جاتا ہے جس کا اختتام غروب آفتاب پر ہے)

اور تم اپنی بیویوں سے نہ ملو جب تم مسجد میں حالت اعتکاف میں ہو

(حالت اعتکاف میں جب کہ اللہ کا بندہ اللہ سے لو لگانے کے لئے مسجد میں مقیم ہوتا ہے' رات کے اوقات میں بھی بیوی سے ملاقات کی اجازت نہیں ہے۔ یہ ایک خصوصی پابندی ہے جو صرف معتکف حضرات کے لئے ہے)

یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں تو ان کے قریب نہ بھٹکنا۔ اسی طرح اللہ واضح کرتا ہے اپنی آیات کو لوگوں کے لئے تاکہ وہ تقویٰ اختیار کریں○

(شریعت کے یہ تمام قوانین اللہ کے مرتب و مدون کردہ ہیں' یہ حدود اللہ نے مقرر کی ہیں' ان سے تجاوز کرنے کا خیال بھی دل میں نہ لاؤ' یہ بات سمجھ لو کہ ان کی پابندی کرنے میں ہی عافیت ہے اور اسی پر اخروی نجات موقوف ہے!)

تاخلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

تحریکِ خلافت پاکستان کا نقیب

ہفت روزہ
ندائے خلافت
لاہور

جلد ۳ شمارہ ۱۵
۱۱ اپریل ۱۹۹۴ء

7

مدیر
اقتدار احمد

معاون مدیر
حافظ عاکف سعید

یکے از مطبوعات
تنظیمِ اسلامی
مرکزی دفتر: ۶۷۔اے، علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو، لاہور

مقامِ اشاعت
۳۶۔کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور
فون: ۸۵۶۰۰۳

پبلشر: اقتدار احمد طابع: رشید احمد چودھری
مطبع مکتبہ جدید پریس ریلوے روڈ لاہور

قیمت فی پرچہ: -/۵ روپے
سالانہ زرتعاون (اندرون پاکستان) -/۱۰۰ روپے

زرتعاون برائے بیرون پاکستان

سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، بھارت	۱۳ امریکی ڈالر
مسقط، عمان، بنگلہ دیش	۱۰ " "
افریقہ، ایشیا، یورپ	۱۶ " "
شمالی امریکہ، آسٹریلیا	۲۰ " "

ایڈیٹر کے ڈیسک سے

زیرِ نظر شمارے کی ضخامت بڑھانے کے باوجود ہم اس موضوع سے براہ راست متعلق ایک تحریر شامل نہ کرسکے جس کی اس پرچے پر چھاپ بہت نمایاں ہے۔ پاکستان کی ایٹمی صلاحیت کے بارے میں امریکہ میں مقیم ہمارے ایک دوست کا نقطہ نظر آپ ان شاء اللہ اگلی دفعہ پڑھیں گے جو گہرے غور و فکر کا متقاضی ہے۔

امیر تنظیم اسلامی و داعی تحریک خلافت پاکستان، محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اپنے جس خطاب جمعہ میں اس دوراہے کی نشاندہی کی تھی جس پر ہمارا وطن آج کھڑا ہے، اس کی تلخیص پیش خدمت ہے۔ دو ہفتوں کے مزید سوچ بچار کے بعد جب انہیں اس ایک راستے کے بارے میں انشراح صدر حاصل ہوگیا جسے اختیار کرنا ملک و ملت کے حق میں خیر کا باعث ہو سکتا ہے تو انہوں نے معذرت خواہانہ انداز اپنائے بغیر اپنا نقطہ نظر ۳۱ مارچ کو تحریک خلافت کے زیر اہتمام منعقدہ ایک مذاکرے میں کھل کر بیان کردیا۔ مذاکرے کی رپورٹ میں قارئین ان کے موقف سے آگاہ ہو جائیں گے۔ انہیں خوب اندازہ ہے کہ بھارت سے مفاہمت و مصالحت کی بات کر کے انہوں نے ہمارے اس قومی مزاج کے شدید مخالفانہ ردعمل کو دعوت دی ہے کہ "آ بیل مجھے مار" جو پچھلی ایک صدی میں ہماری نفسیات کا حصہ بن چکا ہے لیکن نصح و خیرخواہی کے فرمان نبوی ﷺ کی تعمیل میں کوتاہی کا مجرم بننا بھی انہیں منظور نہ تھا لہٰذا اوکھلی میں سر دینے پر مجبور ہوگئے، اب موسلی کے دھمکوں سے کیا ڈرنا۔

رفقائے تنظیم اور معاونین تحریک پر البتہ اب یہ ایک اضافی ذمہ داری عائد ہوگئی ہے کہ "ندائے خلافت" کے اس شمارے کو زیادہ سے زیادہ لوگوں کی نظروں سے گزاریں تاکہ ہمارا موقف دلیل و برہان کے ساتھ ان کے سامنے آجائے۔ پھر وہ اس کی حمایت کریں تو یکسوئی سے کریں اور مخالفت پر آمادہ ہوں تب بھی انہیں یہ اطمینان ہو کہ ہمارا موقف انہوں نے اچھی طرح سمجھ کر رد کیا ہے۔ OO

بقیہ: خطابِ جمعہ

تعالیٰ پر کامل ایمان اور کامل توکل کی ضرورت ہوگی۔ سورۃ محمد ﷺ کی آیت۔ اور آل عمران کی آیت ۱۶۰ میں صاف فرمادیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بندوں کا معاملہ دو طرفہ ہوتا ہے، اس کی جانب رجوع اسی پر توکل اور اسی سے تبتل ہو تو استجابت باہمی، نصرت باہمی بلکہ ذکر باہمی کی نوبت آجاتی ہے۔ گویا ہمارے دوستوں نے ہمیں بے یارومددگار چھوڑ کر اچھا ہی کیا ہے کہ خدا اور خودی کی بیک وقت بازیافت کا ایک سنہری موقع ہاتھ لگا۔ علامہ اقبال کا فلسفہ یہی تو ہے کہ خودی خدا کی معرفت ہی کا نتیجہ ہے اور اس سلسلے میں سید نذیر نیازی کی گواہی بہت معتبر ہے کہ علامہ کا فلسفہ خودی سورۂ حشر کی آیت ۱۹ سے ماخوذ ہے!

ہمیں اپنے موجودہ سیاست دانوں بلکہ پوری کی پوری سیاسی قیادت سے کوئی توقع نہیں رہی کیونکہ وہ سب اقتدار کی Musical Chairs کے کھیل میں دل و جان سے مشغول ہیں اور ہمارے روایتی علماء اور ان کی فرقہ وارانہ تنظیمیں بھی آخری دموں پر ہیں۔ ضرورت تو یہ ہے کہ ہم میں سے جس کو بھی اللہ تعالیٰ احساس کی خلش اور درد کی لذت سے آشنا کردے وہ قرآن کو ہاتھ میں لے کر تجدید ایمان اور اقامت دین کی ایک عوامی تحریک کے لئے کمر کس لے اور اپنے آپ کو ایک نظم میں پرولے۔

حکومتی سطح پر فوری طور پر کرنے کے چار کام ہیں، ان کے لئے مطالبہ کی منظم اور زوردار مہم چلائی جانی چاہئے۔ ایک کتاب و سنت کی بالادستی کی دستوری ضمانت، دوسرے فیڈرل شریعت کورٹ کے سود کے مسئلے پر فیصلے کی حسب ضرورت مہلت لے کر تنفیذ کا عملی پروگرام، تیسرے زمینداری اور جاگیرداری کے مسئلے پر ایک بندوبست اراضی کمیٹی کا بٹھایا جانا اور آخری یہ کہ ملک کے جسمانی طور پر اہل ہر مسلمان کو عسکری تربیت دے کر ایک عوامی فوج کی تشکیل کی جائے کیونکہ نئے عالمی استعمار کو للکارنے کے بعد آڑا وقت آنے پر ہماری باقاعدہ فوج تنہا اس افتاد کو جھیل نہ سکے گی۔۔۔۔ OO

پاکستان دوراہے پر ---- ڈاکٹر اسرار احمد کا اہم خطاب

جو شے کی حقیقت کو نہ سمجھے وہ نظر کیا

تلخیص: اقتدار احمد

۱۸ مارچ کو مسجد دارالسلام باغ جناح میں امیر تنظیم اسلامی نے اپنی باتیں لگی لپٹی رکھے بغیر کہیں

حمد و ثناء' درود و سلام اور سورۃ البقرہ کی آیت ۱۸۶ اور سورۃ الانفال کی آیت ۶۰ کی تلاوت کے بعد کہا کہ میرا ارادہ نئے عالمی استعمار اور عالم اسلام پر اس کے اثرات کا زمان و مکان کے وسیع تر تناظر میں جائزہ لینے کا تھا لیکن جنیوا میں کشمیر کے مسئلے پر اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کمیشن کے سامنے پاکستان کی قرار داد کا حشر دیکھنے کے بعد فیصلہ کیا کہ پاکستان پر خصوصی focus کے ساتھ بات کی جائے۔ یہ تو میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ یہ واقعہ پاکستان کی وزارت خارجہ کے لئے شرم کا مقام ہے اور یہ کہ کہ کم از کم ہمارے وزیر خارجہ کو اس کے بعد مستعفی ہو جانا چاہئے تھا لیکن درپیش صورت حال کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ کوئی منفرد واقعہ نہیں بلکہ نئے عالمی استعمار یعنی نیو ورلڈ آرڈر کی تنفیذ کے عمل کا حصہ ہے۔

نیو ورلڈ آرڈر کیا ہے؟

بالائی سطح پر یہ ایک Unipolar World میں امریکہ کا بطور Sole Supreme Power تسلیم کیا جانا ہے جو اقوام متحدہ کے عالمی ادارے کو اپنے نقاب اور آلہ کار کی صورت میں استعمال کرتا ہے اور اسرائیل کی حفاظت اور سرپرستی جس کے دین ایمان کا حصہ ہے۔ اس عقیدے میں ریپبلیکن اور ڈیموکریٹ دونوں یکساں پختہ ہیں اور جنرل شوارز کرافٹ نے بھی صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ خلیج کی جنگ ہم نے اسرائیل کی حفاظت کے لئے لڑی ہے۔

اس سے نچلی سطح پر نیو ورلڈ آرڈر پورے کرہ ارضی اور بالخصوص تیسری دنیا یعنی ایشیا اور افریقہ کے معاشی استحصال کا منصوبہ ہے جس کے راستے میں حائل رکاوٹیں دور کرنے کی حد تک سیاسی بالا دستی بھی حاصل کی جائے گی۔ اس استحصال کے لئے عیسائی اور یہودیوں نے گٹھ جوڑ کر لیا ہے۔ یہ ملی بھگت "واسپ" یعنی White Anglo-Saxon Protestants اور یہودیوں کے درمیان تو یورپ میں احیائے علوم کے دور میں ہی ہو گئی تھی' رومن کیتھولک چرچ کے ساتھ اس کی گزشتہ چند ہی برسوں میں ڈرامائی انداز میں تکمیل ہوئی ہے۔ سب سے پہلے پوپ کی طرف سے یہودیوں کو بطور قوم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی دینے کے جرم سے بری کرنے کا فرمان جاری ہوا' پھر ویٹیکان نے رسمی طور پر اسرائیل کو تسلیم کر کے یروشلم میں اپنا سفارت خانہ کھولنے کے ارادے کا اعلان کیا اور انہی دنوں اسرائیلی وزیراعظم اسحاق رابن نے امریکہ سے واپسی پر روم میں پوپ سے ملاقات کر کے کوئی شے یہ کہہ کر ان کے حوالے کی ہے کہ گزشتہ تین ہزار سال اس کی حفاظت ہم نے کی' آئندہ یہ آپ کی ذمہ داری ہو گی۔

سب سے زیریں سطح پر یعنی فی الحقیقت نیو ورلڈ آرڈر صیہونیت کا وہ کھیل ہے جو ۱۸۹۷ء میں شروع ہوا اور ۱۹۹۷ء میں جس کا کوئی منطقی انجام سامنے آنے والا ہے۔ گویا یہ عیسائی یہودی گٹھ جوڑ بھی نہیں بلکہ یک فریقی صیہونی سازش ہے جس میں عیسائی دنیا صرف استعمال ہو رہی ہے اور خود امریکہ بھی اسرائیل کا محافظ نہیں بلکہ آلہ کار ہے۔

مکاشفات یوحنا کی ایک تمثیل

بائبل کے باب مکاشفات میں یوحنا نے ایک ہیبت ناک درندے کے ظہور کی پیشین گوئی کی ہے جس کے سات سر (یہ وہی G7 ہو سکتے ہیں جو پوری دنیا کی اقتصادیات کو کنٹرول کر رہے ہیں) اور دس سینگ ہوں گے۔ اس درندے پر ایک خوبصورت لیکن بدکار عورت سوار ہو گی۔ کیا یہی درندہ نیو ورلڈ آرڈر نہیں جس پر اسرائیل کا تسلط ہے؟۔ قرآن مجید میں قرار دیا گیا ہے یہودی کبھی سامنے سے وار نہیں کرتے' دیواروں کے پیچھے سے سنگ باری کرتے ہیں۔ عورتوں کا یہی تو کردار ہوتا ہے!۔ ہمارے دینی لٹریچر بلکہ احادیث صحیحہ سے "المملکت العظمیٰ" اور ظہور دجال کے بارے میں جو تفاصیل ملتی ہیں ان سے یوحنا کے مکاشفات میں بہت گہری مماثلت پائی جاتی ہے۔

افریقہ اور ایشیا کا ردعمل

افریقہ تو اپنے مسائل میں اس بری طرح الجھا ہوا ہے کہ نئے عالمی استعمار کی مزاحمت کی بات سوچ بھی نہیں سکتا' موافق یا مخالف ردعمل صرف ایشیا میں نظر آتا ہے جس کے مشرق بعید میں ابھرتی ہوئی زرد فام قوموں کی طرف سے اپنے زمانے میں ڈیگال نے ہی خبردار کر دیا تھا لیکن یہاں ہمارے جائزے میں ظاہر ہے کہ عالم اسلام کا ذکر سب سے پہلے آئے گا جس کے ضمن میں ہم عربوں کو فوقیت دینے پر مجبور ہیں۔ انہیں یہ شرف حاصل ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ ان میں سے تھے اور ابدی کتاب ہدایت انہی کی زبان میں نازل ہوئی۔ وہ قرآن مجید کو جس سہولت سے سمجھ سکتے ہیں اس کے حصول میں ہمیں کتنے ہی پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ کاش وہ مسلمانوں کی امامت کے منصب پر فائز ہوتے لیکن افسوس کہ ایسا نہیں ہے۔

مشرق وسطیٰ میں واقع عالم عرب تو پوری طرح نیو ورلڈ آرڈر کے شکنجے میں جکڑے جا چکے ہیں اور خلیج کی جنگ نے اس پر آخری مہر لگا دی ہے۔ یہاں کے سب حکمران امریکہ کے سامنے سربسجود ہیں البتہ رعایا میں کچھ جذباتی نوجوان بنیاد پرستی کے جنون میں مبتلا ہو کر یہاں وہاں احیائے اسلام کی چھوٹی موٹی لہریں پیدا کرتے اور کچل دیئے جاتے ہیں۔ آئے دن اخبارات میں ان کی ہلاکت اور فوجی عدالتوں سے سزا پانے کے بعد فائرنگ سکوڈ کے سامنے ڈھیر ہو جانے کی اطلاعات آتی رہتی ہیں تاہم ان پر اصل سخت وقت عنقریب آنے والا ہے جب امریکہ اپنے حواری عرب حکمرانوں کو آخری حکم دے گا کہ یہ ناگوار آوازیں خاموش کر دی جائیں۔ جمہوریت اور انسانی حقوق کے علمبرداروں کو نہ الجزائر میں جمہوری عمل کو تشدد کے استعمال سے معطل کئے جانے پر کوئی پریشانی لاحق ہوئی

نہ مصر و شام میں بنیادی انسانی حقوق کی پامالی پر تشویش ہوتی ہے۔

عرب دنیا میں صرف دو غیر اہم استثناء ات ہیں۔ ایک چھوٹا سا ملک لیبیا جسے معمر قذافی کی متلون مزاجی نے اور بھی غیر اہم بنادیا ہے اور دوسرا سوڈان جو اگرچہ اسلام کی طرف بڑھتا نظر آتا ہے اور جس نے امریکہ کی دھمکیوں کو سہ جانے کا حوصلہ بھی دکھایا ہے لیکن یہ تبدیلی چونکہ ایک فوجی انقلاب کے ذریعے آئی ہے لہٰذا نہیں کہا جاسکتا کب فوج ہی میں سے کوئی اور قوت اٹھ کھڑی ہو جو اس نقشے کو درہم برہم کردے۔

غیر عرب مسلم دنیا

مشرق بعید میں انڈونیشیا صرف نام کا مسلمان ملک رہ گیا ہے۔ عیسائیت کو اس درجہ فروغ حاصل ہو رہا ہے کہ عیسائی مشنریوں کے دعوے کے مطابق ایک عشرے میں پوری آبادی مسیحیت کو قبول کر چکی ہوگی۔ ملائشیا کے وزیر اعظم مہاتیر محمد نے البتہ بڑی جرات دکھائی کہ علی الاعلان بنیاد پرست ہونے کا اقرار کیا ہے اور خلیج کے بحران میں بھی امریکہ کا تابع مہمل بننے سے انکار پر جم کر دکھایا۔ وہاں کے مسلمان بیدار اور فعال ہیں اور شائستگی اور نظم و ضبط کی پابندی میں بھی مثالی حیثیت کے مالک ہیں' بالکل ویسے جیسے پاکستان کے مسلمان بے حس' غیر مہذب اور ہر قاعدے قانون سے آزاد ہونے میں دوسری انتہا پر پہنچ گئے ہیں لیکن وہ ایک چھوٹا سا ملک ہے اور موثر چینی اقلیت نے اسے کوئی قابل ذکر کردار ادا کرنے کے قابل نہیں چھوڑا۔

ایران' افغانستان اور وسطی ایشیا

آس پاس کے علاقے میں افغانستان خود پریشان ہے' وہاں ان شاء اللہ دین کو ہی غلبہ حاصل ہوگا لیکن کب' اس کا جواب آسان نہیں۔ نہ جانے اس اونٹ کے کسی کروٹ بیٹھنے میں کتنا عرصہ لگے۔ وسطی ایشیا کی اسلامی ریاستوں سے بھی بہت توقعات وابستہ کی گئیں لیکن وہ "حیران" ہیں۔ ان کے اسلام کا بھی کوئی بھروسہ نہیں اور سیاسی وابستگی کے بارے میں بھی کوئی حتمی بات نہیں کہی جاسکتی۔ بلکہ یہ بھی عین ممکن ہے کہ کمیونسٹ پارٹی پھر روس میں برسراقتدار آجائے اور ان ریاستوں کو پھر سے اپنے زیر اثر لے آئے البتہ ایران واحد "باغی" حکومت ہے جو خود اپنے آپ کو بنیاد پرست کہتی ہے۔ یہ اسلامی حکومت اگرچہ شیعہ اسلام کی نمائندگی کرتی ہے جس کے مقابلے میں سنی اسلام کی نمائندہ محض ایک حکومت سوڈان میں ہے لیکن ایران کی حکمران جماعت درجہ بدرجہ منظم اور بہت مضبوط مذہبی پیشواؤں پر مشتمل ہے جس کی کوئی نظیر سوڈان میں موجود نہیں اور بہرصورت ایران بھی مسلم دنیا کا حصہ تو ہے ہی۔

ایران کی ایک منفرد خصوصیت

شیعہ اسلام نے ایرانی عوام میں جو فدائیت پیدا کردی ہے اور جس کا مظاہرہ پوری دنیا نے عراق سے ان کی طویل خونریز جنگ میں بچشم سر دیکھا ہے' وہ حادثہ کربلا اور شہادت حسینؓ کی یاد نے پیدا کی جسے زندہ رکھنے اور ہر نوع کی مصدقہ و غیر مصدقہ تفصیلات کے مسلسل اعادے کے زور پر جذبات میں ارتعاش کا ذریعہ بنانے کا سلسلہ صدیوں سے چلا آرہا ہے۔ ایران شیعہ اکثریت رکھنے والا ملک ہے اور شیعہ فدائین ہی اس کی قوت کا اصل راز ہیں جو اس ملک کو نیو ورلڈ آرڈر کے سامنے ڈٹ جانے پر آمادہ کر رہی ہے۔ ایران اس سلسلے میں اپنی سی کوشش شروع کر چکا ہے اور سول سپریم پاور کے مقابلے میں ایک متوازی یا متبادل بلاک بنانے کی تجویز اس کی طرف سے آہی گئی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ نئے عالمی استعمار کا اصل ہدف ایران نہیں' پاکستان ہے۔

پاکستان کی صورت حال

اس موضوع پر میں ڈھکی چھپی رکھے بغیر کھل کر بات کر رہا ہوں کیونکہ آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے۔ یہاں بھی دونوں بڑی سیاسی جماعتیں' تمام اہم سیاسی قوتیں اور سب کے سب مقتدر ادارے امریکہ کے حضور سربسجود ہیں۔ پیپلزپارٹی کا تو ذکر ہی کیا' خود نواز شریف نے بنیاد پرستی سے استعفیٰ کا اعلان کر دیا تھا اور خلیج کی جنگ کے بعد سابق امریکی صدر رچرڈ نکسن نے "Seize the Moment" کے عنوان سے جو کتاب لکھی اس میں وزیر اعظم نواز شریف کو ان کے ترقی پسندانہ رجحانات اور نئے عالمی استعمار کی معاشی حکمت عملی سے مطابقت پیدا کرنے کی کوششوں پر شاباش دی ہے۔ پھر اس میں بھی اب کیا شبہ رہ گیا کہ ہماری فوج بواسطہ اقوام متحدہ امریکہ کی پولیس فورس بن چکی ہے۔ وہ بوسنیا نہیں' صومالیہ بھیجی جاتی ہے اور اگرچہ پاکستان کے ساتھ معاملہ کرنے میں بھی امریکہ اپنی Carrot Policy Stick and پر عمل کر رہا ہے لیکن جلد یا بدیر فوج کو دوسرے درجے کا اسلحہ بھی مل جائے گا' رکے ہوئے F-16 بھی مل جائیں گے اور ان کے فاضل پرزے بھی جن کی عدم موجودگی میں ہم اپنے ایف سولہ سکوارڈن کو ground کرنے پر مجبور ہوئے ہیں اور ہماری معیشت کو سہارا دینے کے لئے آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے ذریعے سودی قرضے بھی آجائیں گے۔

اس کے باوجود بھی پاکستان امریکہ کی Hit list میں پہلے نمبر پر ہے تو اس کے دو سبب ہیں۔ ایک یہ کہ یہاں اس تعلیم یافتہ متوسط طبقے میں بنیاد پرستی پائی جاتی ہے جس کا جذبہ صرف جوش پر نہیں بلکہ ایک مستحکم احیائی فکر کی بنیاد پر استوار ہوا ہے۔ اس احیائی فکر کے پس منظر میں گزشتہ چار صدیوں کی وہ تجدیدی مساعی کارفرما ہیں جن کا شرف پورے عالم اسلام میں صرف برصغیر پاک و ہند کو حاصل ہوا اور رواں صدی میں جسے علامہ اقبال جیسے مفکر نے تقویت دے کر مغربی فکر و فلسفہ کے مقابل سروقد کھڑا ہونے کے قابل بنایا تو مولانا مودودی کے پایہ کے مصنفین نے بہت وسیع پیمانے پر متعارف کرایا۔ اس احیائی فکر کی کوکھ سے جنم لینے والی بنیاد پرستی نے مغرب کو لرزہ براندام کردیا ہے۔

دوسرا سبب پاکستان کے ایٹمی دانت ہیں جو شاید دودھ کے دانت ہی ہوں لیکن امریکہ تو ہماری اس صلاحیت کے بارے یقیناً ہم لوگوں سے بہت زیادہ اور بالکل ٹھیک ٹھیک علم رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ کسی ایسے مرحلے میں ہے جس سے نیو ورلڈ آرڈر کو خطرہ محسوس ہوتا ہے۔

ایشیا کے غیر مسلم ممالک

نیو ورلڈ آرڈر کو ایشیا کے جن غیر مسلم ممالک سے مزاحمت کا اندیشہ ہے' ان میں سرفہرست چین ہے اور پھر اپنی اپنی جگہ شمالی کوریا' جاپان اور بھارت کا نمبر آتا ہے۔ ان میں سے جاپان غیر عسکری لیکن عظیم صنعتی و اقتصادی قوت ہے اور اگر مجوزہ بلاک اسے اپنے ساتھ کھینچ لینے میں کامیاب ہوگیا تو نئے عالمی استعمار کو شاید لینے کے دینے پڑجائیں لیکن اس کا امکان تاحال بعید از قیاس ہے۔ شمالی کوریا محض اپنی ایٹمی صلاحیت کے بل بوتے پر امریکہ کی پریشانی کا باعث بنا ہوا ہے' ایک حد تک زیر دام آبھی چکا ہے تاہم اس کا بھی آخر کار باغی گروہ میں شامل ہو جانا خارج از امکان نہیں۔

اصل درد سر چین ہے

بے تحاشا آبادی' بڑے زمینی پھیلاؤ اور غیر محدود دفاعی صلاحیت نے چین کو نیو ورلڈ آرڈر کے لئے لوہے کا چنا بنادیا ہے جس پر اس کی ایٹمی صلاحیت' جوہری ہتھیار اور دور مار میزائل مستزاد ہیں۔ امریکہ نے اپنی Stick and Carrot Policy کا سب سے زیادہ استعمال اسی ملک پر کیا لیکن پھر بھی چین زیر دام نہیں آیا۔ امریکہ کی طرف سے Most Favoured Nation کا جو تجارتی امتیاز چین کو ملا ہوا ہے' اسے بھی خطرے میں ڈال کر خارجہ امور کے امریکی سیکرٹری وارن کرسٹوفر کو کورا جواب دے دیا گیا ہے کہ ہمارے ہاں انسانی حقوق کا درد آپ اپنے جگر میں نہ رکھیں اور جہاں تک تجارتی مراعات کا تعلق ہے تو وہ ہمارے خیال میں دو طرفہ مفاد کے حامل ہیں۔

بھارت کی پیش بندی

نئے عالمی استعمار کی حکمت عملی میں اہمیت کے اعتبار سے چین کے بعد بھارت کا نمبر ہے۔ یہ بھی کثیر آبادی' بڑا رقبہ اور وسیع وسائل و ذرائع رکھنے والا ملک ہے' جوہری ہتھیار رکھتا ہے اور روائتی اسلحہ کے علاوہ اب دور مار میزائل بھی بنانے لگا ہے۔ یہ امریکہ کے قریب جاکر نیو ورلڈ آرڈر میں کوئی مقام حاصل کرنے کا خواہشمند تھا لیکن کشمیر پر امریکہ کی ڈولتی نیت اور بدلتی نظریں دیکھ کر بدک گیا ہے۔ بھارت نے بجا طور پر اور بروقت بھانپ لیا کہ امریکہ چین سے نپٹنے کے لئے کشمیر کو اپنا اڈا بنانا چاہتا ہے جس کے بعد اس نے برق رفتاری سے اپنی پالیسی بدلی اور چین سے تعلقات میں سرد مہری کو گرم جوشی سے بدل کر دکھادیا یہاں تک کہ اسے پاکستان سے دور بھی کر دیا ہے۔ جس چین کی دوستی پر ہمیں فخر اور اعتماد تھا اسے بھارت کشمیر کے معاملے میں غیر جانبداری کی سطح تک لے آیا ہے جو چین کے اس تازہ موقف سے ظاہر ہے کہ مسئلہ کشمیر کو دونوں فریق آپس میں طے کریں۔ ہمیں یہ بات جنیوا میں اپنی قرارداد کے حشر کے بعد معلوم ہوئی ہے ورنہ ہماری حکومت کے راوی تو چین ہی لکھتے رہے۔ ہماری وزارت خارجہ کی نا اہلی اور بھونڈے اناڑی پن کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہوگا؟۔

ایران کی تجویز

اس پورے تناظر میں اور ہماری قرارداد کی معطلی کے جلو میں ایران کی یہ تجویز آئی کہ ایران' پاکستان' بھارت اور چین مل کر ایک بلاک بنالیں اور ظاہر ہے کہ مطلب اس کا یہ ہے کہ نئے عالمی استعمار کا مقابلہ صرف قوت کو مجتمع کرکے کیا جاسکتا ہے اور اس عمل میں باہمی تنازعات کو جذبات کی ہوا دینے کی گنجائش نہیں ہوتی' تو پتہ چلا کہ ہم کہاں کھڑے ہیں!۔ زمینی حقائق کے اعتبار سے ہم بالکل تنہا ہو چکے ہیں۔ چین اور ایران بھی ساتھ چھوڑ گئے اور بین الاقوامی سطح پر ہم یوں دیوار سے لگ گئے ہیں کہ دو کے سوا ہمارے لئے کوئی تیسرا متبادل راستہ موجود نہیں رہا۔ ایک یہ کہ ہم ایرانی تجویز مان لیں اور دوسرا یہ کہ بدستور امریکہ کے گھڑے کی مچھلی بنے رہیں بلکہ نئے عالمی استعمار کے پورے آلہ کار بن جائیں لیکن اپنے مضمرات کے اعتبار سے یہ دونوں ہی ہمارے لئے خوفناک نتائج کے حامل ہیں۔

پہلا راستہ: نئے بلاک میں شمولیت

ہم ایران کی تجویز مان کر نیو ورلڈ آرڈر کا مقابلہ کریں تو یہ بہت خوب ہے لیکن اس کی جو قیمت ہم سے طلب کی جارہی ہے وہ ہمارے لئے قابل قبول نہیں۔ ظاہر ہے کہ ہمیں کشمیر کو بھول کو "مسئلہ کشمیر" پر بھارت سے باہمی گفت و شنید کے ذریعے کوئی فیصلہ کرنا ہوگا۔ اس کڑوی گولی کو بھی نگل لیں تو مسئلہ کشمیر کے "تھرڈ آپشن" سے واسطہ پڑتا ہے جس پر بحیثیت وزیر اعظم پاکستان' میاں نواز شریف اور بطور وزیر اعظم آزاد کشمیر' سردار عبدالقیوم نیم رضامندی دے بھی چکے ہیں اگرچہ بعد میں مکر گئے۔ پھر اس پر بھی بس نہیں' مسئلہ کشمیر پر باہمی مذاکرات سے بھی پہلے ہمیں بھارت سے تعلقات کو معمول پر لانا ہوگا جس کا مطلب صاف ظاہر ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس ہندو ذہنیت کی زہرناکی کا تریاق کیا ہوگا جس نے ہندو مسلم اتحاد کے نقیب' ہمارے قائد اعظم کو علیحدہ وطن کے مطالبے پر مجبور کردیا تھا؟۔ اس نفرت اور انتقامی جذبے کو کیسے محو کیا جائے گا جس کی بنیاد پر ہم نے تحریک پاکستان کو کھڑا کیا تھا؟۔ ہمیں تو کوئی قد آور' بالغ نظر اور ایک واقعی و حقیقی قومی قیادت بھی میسر نہیں جو بالفرض اگر اس متبادل کو قبول کرنے میں وقتی مصلحت دیکھے تو قوم سے اس کی قبولیت کو منظور بھی کراسکے جیسے ڈیگال نے الجزائر کے مسئلے پر اپنی قوم کے جذبات کو ٹھنڈا کرکے فرانسیسیوں سے اپنی نو آبادی میں جنگ کی طوالت کی بجائے ریفرنڈم کی تجویز منوالی تھی۔

ہماری سیاسی قیادت تو اپنی کوتاہ قامتی اور نااہلی کے باعث عوام کے پیچھے چلنے پر مجبور ہے' قوم کو یہ اپنے پیچھے کیسے لگا سکے گی؟۔

دوسرا راستہ: نیو ورلڈ آرڈر کے ساتھ وفاداری بشرط استواری

دوسرے راستے کے مسافر تو ہم پہلے سے ہیں' اب نیو ورلڈ آرڈر کے پورے آلہ کار بن جانے کا فیصلہ کرنا ہوگا جس کے بعد کسی تکلف کا پردہ بھی حائل نہ رہے گا اور ہماری فوج امریکی استعمار کی باقاعدہ پولیس فورس میں تبدیل ہوجائے گی۔ اس صورت میں ہمیں وہ سب سہولیات حاصل ہوجائیں گی جن کا ذکر پہلے امریکہ سے ہماری توقعات کے ضمن میں آچکا ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ شاید ہمارے ایٹمی پروگرام سے بھی چشم پوشی کا رویہ پھر سے اختیار کرلیا جائے جیسے روس کے خلاف ہمیں استعمال کرتے ہوئے اس طرف سے آنکھیں بند کرلی گئی تھیں۔ اب پھر ہم Front-line State قرار دے دیئے جائیں گے۔

اس تجویز میں بھی یوں تو "سب اچھا" ہے لیکن کشمیر کے مسئلے پر کچھ طفل تسلیوں کے بعد آخر کار وہ ہمارے ہاتھوں سے نکل کر چین کے خلاف نیو ورلڈ آرڈر کا بہت بڑا اڈا بن جائے گا۔ ہمارے خطے میں سرد جنگ کے دوبارہ شروع ہوجانے کے امکانات زیادہ سے زیادہ روشن ہوتے جارہے ہیں جس کے بعد ہماری جغرافیائی اہمیت کے پیش نظر امریکہ کو پاکستان کی خدمات پہلے سے زیادہ درکار ہوں گی۔

"اھون البلیتین": غور و فکر اور مکالمے کی ضرورت

میں خود ان دونوں راستوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کی وکالت نہیں کر رہا لیکن بہرحال چونکہ ہمیں حقائق کا مواجہہ تو بہرصورت کرنا ہے لہٰذا فیصلہ کرنا ہوگا کہ کم تر برائی کون سی ہے' اسے قبول کرلیا جائے۔ اس مسئلے اور اس کے مضمرات پر واقعات و حقائق کی روشنی میں بات چیت شروع ہونی چاہئے' ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ تبادلہ خیال ضروری ہے اور معاشرے کے مختلف اور ذمہ دار طبقات کے درمیان مکالمے کا آغاز ہونا چاہئے۔ عملی مصالح کو دیکھا

(باقی صفحہ ۱۴ پر)

SEIZE THE MOMENT

(قسط دوم)

ایران اور عراق کو بیک وقت مدد دینا ہماری وہ تدبیر تھی جو الٹی ہو گئی

رچرڈ نکسن کو اپنی تشخیص و تجویز میں اور کھلتے دیکھئے

اخذ و ترجمہ: فہیم صدیقی

امریکی پالیسی سازوں کو مسلم دنیا میں کام کرنے کی غرض سے خود بھی وہاں موجود ہمہ جہتی نظریاتی تضادات اور قومیتی اختلافات کے زہریلے سانپوں سے بھرے ہوئے گڑھے میں اترنا ہوگا۔ بنیاد پرستوں میں بھی شدید نظریاتی تصادم پایا جاتا ہے جو بعض اوقات اشتعال کا باعث بھی بن جاتا ہے۔ چھوٹے سے ملک لبنان میں تمام بنیاد پرست دہشت گرد صرف کہنے کو متحد تھے جبکہ چھوٹے سے چھوٹے گروپوں میں بھی باہم نظریاتی اختلاف موجود رہا۔ ہمیں خوب جان لینا چاہئے کہ مسلم دنیا کی تین مختلف و متحارب سیاسی تحریکیں تین ہی بنیادی فکری و نظریاتی لہروں پر سوار ہیں:

۱- بنیاد پرستی:(Fundamentalism)

وہ یکساں اذیت ناک مناظر تصور میں لائیے جو چھوٹی سکرین پر دیکھے جاتے رہے ہیں۔ امریکی یرغمالیوں نے تہران میں ہمارے سفارت خانے کے سامنے اس حال میں پریڈ کی کہ آنکھوں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں' بموں سے بھرے ہوئے ایک ٹرک نے بیروت میں ہمارے میرینوں کی بیرکوں سے ٹکرا کر عمارات اور ۲۴۱ امریکیوں کے پرخچے اڑا دیئے اور ان امریکیوں کے پژمردہ چہرے بشرے جو جنوبی لبنان میں اغوا ہوئے اور قیدی بنا کر رکھے گئے تو یہی انتہا پسند اسلامی بنیاد پرستوں کی عالمی سطح پر سیاسی موجودگی کا مظہر ہے۔ انہیں متحرک کرنے والے جذبات و عزائم میں مغرب سے روزافزوں نفرت اور ماضی کی طرف لوٹ کر اسلامی تہذیب کے احیاء کی خواہش کارفرما ہے۔ یہ لوگ قرآن پر مبنی ایک ایسی شریعت کا نفاذ کرنا چاہتے ہیں جس میں مذہب اور سیاست کی جدائی کو تسلیم نہیں کیا جاتا اور اگرچہ یہ مستقبل کے لئے رہنمائی کی غرض سے ماضی کی طرف ہی دیکھتے ہیں تاہم یہ قدامت پسند نہیں بلکہ انقلابی لوگ ہیں۔ ایک نئی دنیا کی تعمیر سے پہلے وہ نظام کہنہ کو تباہ کر دینے کے درپے ہیں۔

۲- انتہا پسندی:(Radicalism)

مسلم دنیا کے متعدد ممالک میں آمرانہ اور یک جماعتی حکومتیں مسلط ہیں جنہیں انتہا پسندانہ قومی نظریات کے ذریعے جواز دیا جاتا ہے۔ ان میں سے چند ایک مثلاً لیبیا کے قذافی اطالوی مسولینی کی آمریت سے بہت مشابہت رکھتے ہیں جبکہ شام کے حافظ الاسد اور عراق کے صدام حسین جیسے دیگر حکمران وحشیانہ حد تک سخت گیر آمرانہ حکومتوں کے کار مختار ہیں جن سے موازنے میں سٹالن بھی فرشتہ لگتا ہے۔ مغرب کے خلاف بنیاد پرستوں جیسے ہی تلخ جذبات رکھنے والے یہ انتہا پسند اپنے عوام کی حمایت کے حصول کی غرض سے "استعمار" مخالف نعروں کا سہارا لیتے ہیں اور انہوں نے امریکہ اور اس کے اتحادیوں کو زک پہنچانے کی خاطر اکثر سوویت یونین کے مقاصد سے بھی ہم آہنگی اختیار کی۔ ان حکومتوں کی قوت کا راز ان کے رہنماؤں کی کرشماتی شخصیات میں نہیں بلکہ سفاک پولیس اور قوم کی نام نہاد محافظ خفیہ تنظیموں کی کارگزاری میں مضمر ہے۔ ۱۹۸۲ء میں شام کی ایک بستی حمص میں حافظ الاسد نے بیس ہزار مردوں' عورتوں اور بچوں کو اپنی حکومت کی مخالفت کی جرأت کرنے پر جس بے رحمانہ انداز میں تہہ تیغ کیا' وہ اس کی ایک مثال ہے۔

۳- جدت پسندی:(Modernism)

ترقی پسندی کی لہر اس کوشش میں ہے کہ مسلم دنیا کو ترقی یافتہ دنیا کو سیاسی اور معاشی میدانوں میں ترقی یافتہ دنیا کے شانہ بشانہ لا کھڑا کرے۔ ترقی پسند اسلام میں وسیع المشربی اور رواداری کا عنصر نمایاں ہے جو مغرب کو کافر و ملحد قرار دے کر مطعون نہیں کرتا' اہل کتاب سمجھ کر گلے لگاتا ہے۔ ترکی اور پاکستان جیسے کچھ ترقی پسند ملکوں میں جمہوریت ہے۔ مصر اور انڈونیشیا میں آزاد معاشرے ہیں لیکن مغرب کے جمہوری معیار پر پورے نہیں اترتے' حکمرانی کے جواز کے لئے انتخابات کی کسی نہ کسی شکل کی ضرورت البتہ محسوس کی جاتی ہے۔ جدت پسند سیاسی رہنماؤں کا کہنا یہ ہے کہ ان کے ممالک کو اپنے قومی کلچر اور معاشرتی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے مغرب کی بہترین اقدار کو اپنا لینا چاہئے۔

ہمیں اسلامی انتہا پسندوں کی کارروائیوں کو اسلامی عقیدہ سے ہرگز نہیں جوڑنا چاہئے۔ متشدد بنیاد پرست گو کہ عوام میں نمایاں ہیں لیکن ان کی انتخابی حیثیت بہت کمزور ہوتی ہے۔ حالیہ برسوں میں ارڈن' مراکش' ملائشیا' پاکستان اور الجزائر میں بنیاد پرستوں کی تعداد میں اگرچہ معتدبہ اضافہ ہوا ہے لیکن اقتدار وہ صرف ایران میں حاصل کر سکے جہاں وہ ایک عشرے کی لوٹ مار اور ایران عراق کی بے مقصد جنگ کی وجہ سے اپنی حیثیت کے اثاثے میں کمی کے سوا کچھ نہ پا سکے۔ مسلم ممالک میں بنیاد پرست عوام کو بلند بانگ نعروں سے ہانک کر سڑکوں پر تو لا سکتے ہیں لیکن انتخابات کے ذریعہ اقتدار تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے۔

مسلم ممالک کے عوام انقلاب کے خواہاں ہیں جن میں ۶۰ فیصد سے زیادہ ۲۵ سال سے کم عمر کے ہیں۔ وہ غریب ہیں' فی کس آمدنی اوسط میں خلیجی مالدار ممالک کو ملا کر بھی ۱۶۰۰ ڈالر سالانہ ہے جبکہ امریکہ میں یہ ۲۱۰۰۰ ڈالر سالانہ ہے۔ ان کی اکثریت کی اپنی حکومتوں میں کوئی شنوائی نہیں ہوتی کیونکہ مسلم دنیا کے صرف ۲۷ فیصد لوگ جمہوری ملکوں میں رہتے ہیں۔ مسلم بنیاد پرستوں کی پذیرائی مثبت پر کم

اور منفی عوامل پر زیادہ ہے یعنی اپنے مثالی نظام زندگی کی آرزو میں کم اور موجودہ بدعنوان حکومتوں سے نفرت کے باعث زیادہ جو ان کے حال میں اصلاح اور مستقبل میں کسی خوشگوار تبدیلی کی امیدیں جگانے میں ناکام رہی ہیں اور اس مایوسی کو سوویت یونین کے مادہ پرستانہ نظریات اور صارفین کے مغربی معاشرے کے کھوکھلے پن نے بھی تقویت دی ہے۔

یہ ہمارے مفاد میں ہے اور ان کے فائدے میں بھی کہ ہم مسلم دنیا کے معتدل اور ترقی پسند رہنماؤں کی مدد کریں تاکہ وہ اپنے عوام کو انتہائی بنیاد پرستی اور خالص سیکولرزم کے بین بین کوئی متبادل لیکن مثبت راہ دکھا سکیں۔ کویت کے حکمران صدام حسین کے قبضہ سے نکلنے کے بعد بھی بامقصد جمہوری سیاسی اصلاحات کے لئے تیار نہیں ہیں۔ یہ بے حسی کی انتہا ہے اور مسلم دنیا میں ایسے بے نیاز مطلق العنان حکمرانوں کی کمی نہیں۔ ہمیں اپنے دوست حکمرانوں کو مدد دیتے وقت یہ واضح کردینا چاہئے کہ ہم کسی ایسے حکومتی نظام کو پسند نہیں کرتے جس میں عوام کی آواز سے حکمرانوں کے کانوں پر جوں بھی نہ رینگتی ہو۔

اپنا لائحہ عمل مرتب کرتے ہوئے ہمیں اپنے دوستوں اور دشمنوں میں تمیز کرنی چاہئے۔ یہ موقع پرستی قرار دی جائے گی لیکن واقعہ یہ ہے کہ امریکی پالیسی سازوں نے اس بنیادی اصول کا "اعزاز" کئی بار اس سے انحراف کے ذریعے کیا ہے۔ یرغمالیوں کے عوض تاوان کی مد میں ایران کی انتہائی بنیاد پرست حکومت کو ہتھیاروں کی فراہمی اور عراق کی سرکشی کی حد تک انتہا پسند قیادت کو اربوں ڈالر کے اسلحہ کی فروخت دو تازہ مثالیں ہیں جن میں امریکی حکومت نے ہمارے جانی دشمنوں کو گلابی رنگ کے شیشوں والی عینک کے پیچھے سے دیکھا۔ ہمارے جو ارباب حل و عقد لبنان سے امریکی یرغمالیوں کی رہائی کے حصول کی غرض سے شام اور ایران کی خدمت میں قصیدے پیش کرسکتے ہیں' ان سے اس طرح کی غلطیوں کا اعادہ ہرگز بعید نہیں۔ بے قصور اسیروں کو رہا کرنے والے بھی کیا کسی تعریف کے مستحق ہیں؟۔ دمشق اور تہران کو وہ کام آج کرنے پر کوئی مفاد کیوں حاصل ہو جو سات سال قبل کرنا ان پر واجب تھا! یہ توقع عبث ہے کہ دنیائے اسلام کے اسدوں' رفسنجانیوں اور قذافیوں میں بھی کبھی اپنے لئے اسلامی ہیولوں کا کردار منتخب کرنے کی خواہش پیدا ہوگی۔

(یعنی وہ اپنے موجودہ منفی طرز عمل کو کبھی "ہیول" کی طرح مثبت بنانے کی طرف مائل نہ ہوں گے واضح ہو کہ مسٹر واکلاف ہیول چیکوسلواکیہ کا ایک معروف ادیب و شاعر ہے جو اکتوبر ۱۹۳۶ء میں پراگ کے ایک "بورژوا" گھرانے میں پیدا ہوا اور اپنے فن خصوصاً ڈرامہ نگاری سے کیمونزم کی خدمت کرتا رہا تاآنکہ ۱۹۶۸ء میں خیالات میں تبدیلی آنے کے بعد چیک سوشلزم کی اصلاحی تحریک میں سرگرم ہو جانے کی بنا پر جب وہ روس کی سوویت حکومت کے عتاب کا شکار ہوا جو اسی سال چیکوسلواکیہ پر چڑھ دوڑی تھی تو اس نے ترغیب و ترہیب کے ہر کیمونسٹ حربے کو ناکام بنا کر اپنی سوچ تبدیل کرنے سے انکار کردیا۔ طویل جیل کاٹی لیکن اپنے بین الاقوامی طور پر شہرت یافتہ طنزیہ ڈراموں کے ذریعے چیکوسلواکیہ میں انسانی حقوق کا علمبردار بنا رہا------مدیر)

امریکی رویے میں امتیازی حکمت عملی کی کلید یہ ہونی چاہیے کہ ہم صرف جدت پسند حکومتوں کے ساتھ دفاعی سمیت ہمہ جہتی تعاون کریں جبکہ بنیاد پرستوں اور انتہا پسندوں کو موقع کی مناسبت سے صرف محدود اور غیر فوجی امداد فراہم کی جائے۔ چونکہ ہمارے اور ترقی پسند حکومتوں کے اہداف مشترک ہیں لہٰذا ان سے ہمارا تعاون معاشی اور دفاعی معاملات کی پوری وسعت پر محیط ہونا چاہئے۔ پھر چونکہ بنیاد پرستوں اور انتہا پسندوں سے ہمارا ٹکراؤ مفادات اور اقدار میں بھی ہے لہٰذا ان سے ہمارے تعلق کو وقتی ضرورت سے لحہ بھر بھی بڑھنے کی اجازت نہ دی جائے۔ ہم کو نہ ہی ان سے وسیع تر اشتراک عمل کرنا چاہئے اور نہ ہی تجارتی پابندیوں یا معاشی مقاطعہ کے ذریعہ انہیں بالکل تنہا چھوڑ دینا چاہئے تاہم ایران جیسی حکومتوں میں شامل معدودے چند جدت پسندوں کی تلاش ضروری نہیں اور نہ ہی عراق کے حکمران جیسے لیڈروں کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آنے کی ضرورت ہے جس کا مظہر اس کے پڑوسی ملکوں کے ساتھ سرحدی تنازعہ پر امریکہ کی خاموشی بھی ہو سکتی ہے۔ گویا ہمیں مکمل مقاطعہ تو نہیں کرنا چاہئے' اتنا قرب بھی ٹھیک نہیں جس سے ان کی حوصلہ افزائی ہوتی رہے۔ ہمیں تو ہر معاملے کو الگ الگ ٹھنڈے دل و دماغ سے نمٹانا ہوگا۔

بہت سے ناقدین عراق ایران جنگ میں امریکی پالیسی کی مذمت کرتے ہیں۔ انہیں اعتراض ہے کہ ہم نے یکے بعد دیگرے جنگ کی کیفیت دیکھ کر دونوں متحارب ممالک کی مدد کی۔ ان کا اعتراض محض جزوی طور پر ہی درست ہے۔ ہمارے مفادات کا تقاضا تھا کہ اس جنگ میں کوئی بھی فریق واضح برتری حاصل نہ کرسکے۔ لہٰذا ریگن انتظامیہ نے صحیح طور پر دونوں فریقوں کی مدد کی۔ غلطی تو یہ ہوئی کہ ایران کی جارحانہ صلاحیت کا صحیح اندازہ نہ کرتے ہوئے عراق کو بہت زیادہ اسلحہ دے دیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس جنگ کے بعد صدام حسین فوجی لحاظ سے کسی بھی نئی عسکری مہم جوئی کے قابل ہوگیا۔ اس طرح کی صورت حال میں اگر ہمیں تعاون کرنا ہی پڑے تو انتہا پسند حکومتوں سے تعلقات میں خوب سوچے سمجھے کچھ فاصلے رکھنے ضروری ہوجاتے ہیں۔ عراق نے ہمیں بہت اچھا سبق دیا ہے کہ آج کا دوست کل کا جانی دشمن بھی بن سکتا ہے۔ ہم سے صدام حسین کے ساتھ دوستی کی غلطی کا ازالہ ۱۰۰ ارب ڈالر کے خرچ اور ۱۴۸ امریکی زندگیاں قربان کرنے کے بعد ممکن ہوا ہے۔

آج بہت سے تجزیہ نگاروں کا موقف یہ ہے کہ شام کے حافظ الاسد سے باہمی تعاون کے لئے تعلقات بڑھانے کی بڑی گنجائش نکل آئی ہے لیکن مصلحت بینی اور عاقبت اندیشی کا تقاضہ مختلف ہے۔ اسد سے معاملہ کرتے ہوئے ہمیں کسی خود فریبی مین مبتلا نہیں ہو چاہئے۔ اس نے عراق کے خلاف اتحادیوں کا ساتھ اس لئے نہیں دیا تھا کہ اپنی سابقہ پالیسی میں کوئی تبدیلی لے آیا تھا۔ اصل میں چونکہ انتہا پسند عرب دنیا کے قائد کے منصب کا دعویٰ حافظ الاسد بھی رکھتا تھا لہٰذا یہ ایک نادر موقع تھا کہ صدام حسین منظر سے ہٹ جائے اور یہ قیادت پکے پھل کی طرح حافظ الاسد کی جھولی میں آگرے۔ اس حکمت عملی کے باعث اسد کو لبنان میں آزادانہ کام کرنے کا موقع بھی مل گیا جس کی آڑ میں اسے سعودی عرب' کویت اور عرب امارات سے ۳ ارب ڈالر کی مجموعی امداد بھی مل گئی۔ ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ اسد اپنے علاقائی سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے اب بھی فوجی طاقت پر بھروسہ کرتا ہے اور بدستور بین الاقوامی دہشت گردی کے بڑے سرپرستوں میں سے ایک رہے گا۔

مسلم دنیا کے زمانی ارتقاء کے لئے ہمیں محض کوئی ایک مکمل اور ایسی جامع سیاسی حکمت عملی اختیار کرنے کی ضرورت نہیں جو تمام مسلم ممالک پر یکساں لاگو ہو۔ اس کے بجائے ہمیں صرف ان چند مرکزی مقامات کا انتخاب کرلینا چاہئے جہاں ہماری موجودگی ضروری ہے۔ ہمیں ایسی چنیدہ جدت پسند حکومتوں ہی سے اشتراک عمل کرنا چاہئے جن کا علاقے میں اثر و نفوذ ہو اور جن کے ساتھ ہمارا لائحہ عمل متوازی ہو' مفاد مشترک۔ ان کے ساتھ سیاسی و دفاعی اشتراک

عمل' مشاورت باہمی اور معاشی استحکام میں ان کی مدد کرنے سے انہیں جو نمایاں فوائد حاصل ہوں گے وہ اس علاقہ کی دوسری مسلم ریاستوں میں کامیابی کی مثالیں سمجھی جائیں گی اور وہاں پائے جانے والی ترقی پسند قوتوں کو تقویت دیں گی۔ یوں اگلے دو تین عشروں میں یہ جدت پسند ممالک اپنے اندر وہ سیاسی اور معاشی مقناطیسیت پیدا کرلیں گے جو پورے علاقے کے لئے اپنے اندر پرامن تبدیلی کے ذریعے مثبت رویہ اپنانے کے عمل کو پرکشش بنادے۔

اس حکمت عملی پر عمل درآمد کے لئے چار نمایاں ممالک سامنے آتے ہیں جن سے منطقی اشتراک ہوسکتا ہے:

۱- ترکی:

یہ ایک ایسا ملک ہے جو مسلم اور مغربی دنیا کے درمیان جغرافیائی اور تہذیبی پل کا کام دے رہا ہے۔ یہاں ایک گوارا حد تک جمہوری حکومت گزشتہ ۹ سال سے کام کررہی ہے جس نے معاہدہ نیٹو میں دوسرے رکن ممالک کے مقابلہ میں زیادہ فوجی تعاون کیا۔ ہمیں اپنے یورپی اتحادیوں کو مجبور کرنا چاہئے کہ وہ ترکی کو یورپی برادری اور مغربی یورپ کی یونین میں شامل کرلیں۔ اس کے علاوہ بھی ترکی کی حوصلہ افزائی ضروری ہے تاکہ وہ اپنے تاریخی اور تہذیبی رشتوں کے حوالے سے مشرق وسطیٰ میں اپنے سیاسی اور معاشی اثر و رسوخ کو زیادہ فعال بناسکے۔ عربوں اور اسرائیل کے مابین امن مذاکرات میں کامیاب پیش رفت ہوتی ہے تو اس کے بعد پانی کی فراہمی کے معاملے کو زیر بحث مسائل میں سرفہرست رکھا جاسکے گا کیونکہ ترکی میٹھے پانی کے وسائل سے مالا مال ہے۔ وہ اسرائیل' شام اور علاقے میں پانی سے محروم دیگر ممالک کو زیر زمین آبی راستوں کے ذریعے بھی اس قلت سے نجات دلا سکتا ہے۔

۲- پاکستان:

ترکی اور جاپان کے مابین واقع فوجی نوعیت کے انتظامات میں امریکہ کا واحد حلیف پاکستان ہے جس نے افغان مزاحمت میں مدد دینے کے لئے حالیہ عشروں میں امریکہ کا بہت ساتھ دیا اور ۱۹۷۲ء میں چین کے ساتھ امریکہ کے تعلقات کو ممکن بنایا۔ اگرچہ اسلام آباد کی پالیسیاں بعض اوقات ہماری حکمت عملی سے ٹکراتی ہیں' خاص طور پر ایٹمی صلاحیت کے ضمن میں لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ روسی جارحیت کے سامنے ہماری طرف سے سینہ سپر ہونے میں اس جیسی ہمت و جرات کا مظاہرہ کسی اور نے نہیں کیا۔ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان کشمیر کے معاملہ میں کسی ممکنہ ایٹمی تصادم کو روکنے کے لئے ہمیں نئی دہلی پر زور دینا چاہئے کہ وہ اپنے اس صوبے میں فوجی طاقت کے بل پر انسانی حقوق کی اتنی وسیع پامالی بند کرے اور کشمیری رہنماؤں کے ساتھ صوبائی خود مختاری پر مذاکرات کا دروازہ کھلا رکھے۔ ۱۹۹۰ء کے جمہوری انتخابات جیتنے کے بعد وزیر اعظم نواز شریف نے پاکستان کو کھلی منڈی بنانے کے لئے ضروری اصلاحات کی طرف فیصلہ کن پیش رفت کی ہے جس میں ٹیکس کی شرح میں کمی' صنعتوں کی نج کاری اور غیر ضروری سرکاری کارروائیاں ختم کرنا شامل ہیں۔ اسلام آباد جیسے جیسے ان اصلاحات کو نافذ کرتا جائے' ہمیں چاہئے کہ امریکی تاجروں کو پاکستان میں سرمایہ کاری کی ترغیب دیں تاکہ اصلاحات کو تقویت پہنچائی جاسکے۔

۳- مصر:

اس کی آبادی عرب دنیا کی آبادی کا ۳۵ فیصد ہے۔ یہی وہ واحد عرب ملک ہے جس نے اسرائیل سے امن کا معاہدہ کیا۔ دس سال تک کیمپ ڈیوڈ معاہدہ کے بعد عرب لیگ سے نکالا جانے والا مصر اب پھر اس کے فطری رہنما کی حیثیت سے ابھرا ہے۔ عرب اسرائیل معاہدہ امن پر عملدرآمد کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لئے ہمیں مصریوں کے ساتھ ایک متحدہ محاذ بنانا چاہئے کیونکہ مصر خلیجی جنگ میں اپنے رویہ کے باعث ہمارے نزدیک بہت قدر و منزلت اور سیاسی اہمیت حاصل کرچکا ہے۔ اپنے اس رویہ کی وجہ سے اس کے جو قرضے معاف ہوئے اور مزید امداد جو ملی ہے اس سے مصر کو اپنے ہاں کھلی منڈی کی معیشت کو کسی بڑی داخلی بے چینی کا سامنا کئے بغیر مستحکم کرنے کا موقع ملنا چاہئے۔ ہمیں مصری حکومت کی اس انداز میں مدد کرنی چاہئے کہ اصلاحات کا فائدہ عوام تک پہنچے' بدعنوان بیوروکریسی کی بھینٹ نہ چڑھ جائے۔

۴- انڈونیشیا:

دو ہزار میل لمبی جزیروں کی اس زنجیر میں دنیا کا پانچواں سب سے زیادہ آبادی والا ملک واقع ہے جس نے اقتصادی ترقی کی راہ میں کافی پیش رفت کی ہے چاہے ابھی تک وہاں ایک آمرانہ حکومت ہی کا تسلط ہے۔ صدر سوہارتو کے دور میں جنہوں نے ۱۹۶۷ء میں حکومت پر قبضہ کیا' فی کس آمدنی پچاس ڈالر سے بڑھ کر ۵۰۰ ڈالر سالانہ ہوگئی ہے۔ صدر سہارتو نے آبادی کے بے تحاشا اضافے پر کافی کنٹرول کیا ہے۔ مسلم دنیا میں کھلی منڈی کی معیشت کے آغاز کا سہرا سر پر سجا کر انڈونیشیا نے اپنی تجارت کو آزاد کردیا' درآمدی محصولات کو کم کیا اور سرکاری سرخ فیتہ کاٹ پھینکا۔ یہ اگرچہ دنیا کے تیل برآمد کرنے والے بڑے ملکوں میں سے ایک ہے تاہم اس کی تیل کے علاوہ دیگر اشیاء کی برآمدات نے ۱۹۹۱ء میں تیل سے دگنا زرمبادلہ کمایا ہے۔ انڈونیشیا ۱۹۶۷ء سے اب تک امریکہ اور دوسرے مالیاتی اداروں سے لئے ہوئے اپنے قرضے باقاعدگی سے واپس کررہا ہے' کبھی نادہند نہیں ہوا نہ کبھی ادائیگی میں مہلت طلب کی۔ حق یہ ہے کہ مالیاتی امور میں اس کے احساس ذمہ داری اور آزاد معیشت کے اصولوں کی پاسداری کا انعام یہ ہونا چاہئے کہ ہم انڈونیشیا کے ساتھ گہرے روابط اور مربوط اشتراک عمل قائم کریں۔

اس کا یہ مطلب بہرحال نہیں ہے کہ ہم دوسرے جدت پسند ممالک اور مغرب کی حمایت کرنے والی دیگر ریاستوں کو طاق نسیاں میں رکھ چھوڑیں۔ شاہ حسن نے جو مسلم دنیا کے بہت روشن خیال حکمرانوں میں سے ایک ہیں' مراکش میں ترقی پسندانہ پالیسیاں جاری کی ہیں اور دفاعی معاملات میں امریکہ کے ساتھ بہت قریبی تعلقات کار قائم رکھے ہیں۔ سعودی بادشاہت بھی امریکہ سے بہت اہم رشتوں میں بندھی ہوئی ہے باوجودیکہ داخلی طور پر وہاں شاہی آمریت ہے۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی ریاست کسی محوری حیثیت کے حصول کا امکان نہیں رکھتی۔ ان کا سیاسی وزن مسلم دنیا کو کسی ایک یا دوسری سمت میں موڑ لے جانے کی صلاحیت سے بہرہ ور نہیں۔ OO

استحکام پاکستان
اور مسئلہ سندھ
ہر درد مند پاکستانی کے لیے اِس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے
قیمت ۲۵ روپے
ملنے کا پتہ: انجمن خدام القرآن
۳۶-کے ماڈل ٹاؤن لاہور

"کشمیر اور پاکستان" — تحریکِ خلافت کا مذاکرہ

داعیٔ تحریک نے سوچ کی ایک نئی راہ دکھائی

قرآن آڈیٹوریم میں تالی پٹنے کا واقعہ پہلی دفعہ لیکن صرف ایک بار ہوا

مرتبہ: نثار احمد ملک

"تحریک خلافت پاکستان" کے زیر اہتمام ۳۱ مارچ ۹۴ء بروز جمعرات بعد از نماز مغرب "مسئلہ کشمیر اور پاکستان" کے موضوع پر ایک سیمینار منعقد ہوا۔ مذکورہ موضوع پر اس سیمینار کا پس منظر یہ ہے کہ ۱۸ مارچ کو امیر تنظیم اسلامی و داعی تحریک خلافت پاکستان جناب ڈاکٹر اسرار احمد نے نیو ورلڈ آرڈر کے وسیع تر تناظر میں پاکستان کو درپیش مسائل پر مفصل خطاب فرمایا تھا۔ جس کی تلخیص "ندائے خلافت" کے زیر نظر شمارے میں موجود ہے۔ اس خطاب کا پس منظر اس قرار داد کی واپسی پر پیدا ہونے والی بے چینی تھی جو حکومت پاکستان نے اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کمشن میں پیش کی اور بعد میں "موخر" کر دی۔

تحریک خلافت پاکستان نے اس اہم مسئلہ پر ملک کے متعدد دانشوروں اور سیاست دانوں کو اظہار خیال کے لئے مدعو کیا اور اگرچہ سیاست دانوں میں سے اکثر اپنا وعدہ وفا نہ کر سکے تاہم جن صحافی اور دانشور حضرات کو مدعو کیا گیا تھا' وہ تشریف لائے اور اس اہم مسئلہ پر اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔ سیمینار کا آغاز محترم حافظ عاکف سعید نے تلاوت کلام پاک سے کیا جبکہ سٹیج سیکرٹری کی ذمہ داری تحریک خلافت پاکستان کے ناظم اعلیٰ جنرل ایم ایچ انصاری نبھا رہے تھے جنہوں نے موضوع زیر بحث کے پس منظر پر انتہائی اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی۔ انصاری صاحب نے فرمایا کے مسئلہ کشمیر گزشتہ نصف صدی سے مسلمانان پاکستان کے لئے سوہان روح بنا ہوا ہے۔ آپ نے اس مسئلہ کی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ہمارے لئے یہ موت اور زندگی کا مسئلہ ہے۔ جغرافیائی اعتبار سے اگر جائزہ لیا جائے تو کشمیر واقعۃً پاکستان کی شہ رگ ہے۔ آپ نے کہا کہ اس مسئلہ کے تین فریق ہیں' پاکستان مدعی' بھارت مدعا علیہ اور اقوام متحدہ

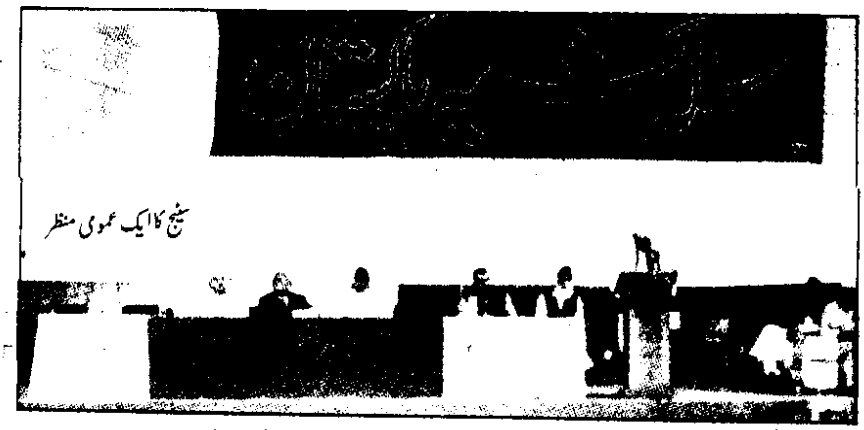

سٹیج کا ایک عمومی منظر

بطور ثالث۔ کسی بھی مسئلہ کا روح رواں مدعی ہوا کرتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ مدعی نے اپنی ذمہ داری کس حد تک نبھائی ہے۔

جنرل صاحب نے ۱۹۴۸ء کے بھارتی غاصبانہ حملہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ مجاہدین کی محنتوں سے کامیابی پاکستان کے حق میں ہونے والی تھی کہ بھارت نے مسئلہ کو سلامتی کونسل میں جا اٹھایا۔ گویا بھارت نے شنوائی میں پہل کا حق ہم سے چھین کر اپنے قبضے

جنرل ریٹائرڈ ایم ایچ انصاری: کشمیر کے مقدمے میں پاکستان مدعی ہے' بھارت مدعا علیہ۔ مدعی سست رہا تو گواہوں کی چستی کا کیا فائدہ!

میں لے لیا اور پھر مذاکرات کی آڑ میں بھی خاصا وقت ضائع کیا۔ محترم جنرل انصاری صاحب نے ۶۵ء کی جنگ' معاہدہ تاشقند' ۷۱ء کی ناکامی اور شملہ معاہدے کا ذکر بھی کیا۔ آپ نے کہا کہ شملہ معاہدے کے بعد اب ۲۲ سالوں میں فوجی بھی برسراقتدار رہے اور دائیں بازو کی جماعتیں بھی' نیم مذہبی لوگ بھی رہے اور لبرل بھی لیکن مسئلہ کشمیر جہاں پہلے تھا وہیں آج بھی ہے۔ جنرل صاحب نے اپنی گفتگو سمیٹتے ہوئے کہا کہ پاکستانی عوام سوال کرتے ہیں کہ یہ مسئلہ کب اور کیسے حل ہو گا؟

اس کے بعد جنرل انصاری صاحب نے کمو ڈور (ریٹائرڈ) جناب طارق مجید کو دعوتِ خطاب دی۔ جناب طارق مجید ہمارے عسکری دانشوروں میں شمار کئے جاتے ہیں' انگریزی اور اردو ہر دو زبانوں میں بین الاقوامی مسائل پر لکھتے ہیں۔ آپ نے اپنی گفتگو کے آغاز میں فرمایا کہ یہ وقت مسلمانان پاکستان کے لئے واقعۃً گہرے غور و فکر اور تشویش کا ہے۔ آپ نے کہا کہ غور و فکر تو ضرور ہونا چاہئے لیکن مایوسی کے اندھیروں کو قریب بھی نہیں پھٹکنے دینا چاہئے۔ دشمن بھی یہی چاہتا ہے کہ پاکستانی قوم یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے کہ اب نکلنے کا کوئی راستہ ہے ہی نہیں!۔

اور اسلحہ پر خرچ نہیں کرنے چاہیں اگرچہ آج یہ اخراجات ناگزیر ہیں۔ محمود مرزا صاحب نے کہا کہ مسئلہ کشمیر کے حل کے لئے فوج اور موثر سیاسی گروہوں کو کسی ایک حل پر پہنچا ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ کشمیر کو سلامتی کونسل کی "تولیت" میں دیا جائے لیکن اس ٹرسٹی شپ پر عمل درآمد مختلف ممالک کے ذریعے کرایا جائے گا۔ اس تجویز پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خود مختار کشمیر کی طرف جاتی ہے۔ انہوں نے ڈاکٹر مبشر حسن صاحب کی اس تجویز کا ذکر بھی کیا جس میں انہوں نے پورے کشمیر کو داخلی خود مختاری دینے کی بات کی۔ اس طرح آزاد کشمیر کا دفاع پاکستان اور مقبوضہ کشمیر کا بھارت کے ذمے ہوگا۔ اس تجویز میں وہاں کے شہریوں کی فیڈریشن بنانے کا ذکر بھی موجود ہے۔ یہ فیڈریشن اس لئے ضروری ہے کہ وہاں کے لوگوں میں ثقافتی، لسانی تہذیبی اور مذہبی یک رنگی نہیں پائی جاتی۔

ہمارے اگلے مقرر معروف دانشور، صحافی ہفت روزہ زندگی اور قومی ڈائجسٹ کے چیف ایڈیٹر جناب مجیب الرحمٰن شامی تھے۔ جناب شامی نے اپنی گفتگو کے آغاز میں کہا کہ مختلف دانشوروں، تنظیموں اور ممالک کی طرف سے مسئلہ کشمیر کے حل کے لئے پیش کی جانی والی تجاویز کی اہمیت قیام پاکستان سے قبل پیش کی جانے والی تقسیم کی مختلف سکیموں سے زیادہ نہیں ہے۔ جناب شامی نے کہا کہ آج مسئلہ کشمیر ایک متنازعہ مسئلہ کے طور پر دنیا کے سامنے آچکا ہے۔ مسئلہ کشمیر کے ضمن میں بھارتی رویے کا ذکر کرتے ہوئے شامی صاحب نے کہا کہ بھارت نے سرکاری و غیر سرکاری ہر دو سطح پر مسئلہ کشمیر کو قبول نہیں کیا۔ مختلف لوگوں کی طرف سے تھرڈ آپشن کے پس منظر میں آپ نے کہا کہ ہمارے سامنے اقوام متحدہ کی قرار دادیں موجود ہیں۔ ہمیں اس بات پر سوچنا اور کام کرنا ہے کہ کشمیری بھارت اور پاکستان میں سے کس کے ساتھ الحاق کرتے ہیں۔ جب تک اقوام متحدہ کی طرف سے کسی "تھرڈ آپشن" کی بات سامنے نہیں آتی، ہمیں عوامی سطح پر اس قسم کی کوئی بات نہیں کرنی چاہئے۔ ہمیں اپنے قومی و ملی مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے نہ خود ان سے انحراف کرنا ہے نہ ہی اپنے رہنماؤں کو منحرف ہونے دینا ہے۔

شامی صاحب نے خود مختار کشمیر کے حوالے سے کہا کہ اس موقف کے حاملین بھی ہمارے موقف سے قریب ہیں۔ اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ وہ جانتے ہیں کہ خود مختار کشمیر بھارت کی موجودگی میں قائم رہ ہی نہیں سکتا لہٰذا دستوری سطح پر اسے پاکستان کے ساتھ ملنا پڑے گا۔ انہوں نے یہ بات بڑے زور دار انداز میں کہی کہ کشمیر اور پاکستان کو یکجا رکھنا ضروری ہے نیز کشمیر بھارت کا حصہ نہیں رہ سکتا، نہ ہی رہنا چاہئے اور نہ رہنے دیا جائے گا۔ شامی صاحب نے جنیوا قرارداد کی واپسی کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ اس قرارداد کی واپسی اتنا بڑا جرم نہیں جتنا بڑا جرم اس کو وہاں پیش کرنا تھا۔ ہمارے دیرینہ دوست خود انسانی حقوق کے مسئلے سے دوچار ہیں۔ اس ضمن میں انہوں نے چین اور ایران میں انسانی حقوق کے مسئلے کا ذکر کیا۔ امریکہ چین اور ایران دونوں کو خبردار کر چکا ہے کہ وہاں انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں ہو رہی ہیں۔ اسی طرح کے حالات کا سامنا برادر اسلامی ملک سوڈان کو ہے لہٰذا اگر یہ دوست ہماری تائید کرتے تو پھر وہاں بھی کمشن بھیجے جانے کا جواز اقوام متحدہ اور امریکہ کو فراہم ہو سکتا تھا۔

جناب شامی نے کہا کہ مسئلہ کشمیر کے ضمن میں سب سے افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ ہمارے رہنما اس مسئلہ پر داخلی سیاست کو گھٹانے یا بڑھانے کا مکروہ کھیل کھیل رہے ہیں۔ مسئلہ کشمیر پر بھارت کی پالیسی کا ذکر کرتے ہوئے جناب شامی نے کہا کہ بھارت میں دونوں ایوانوں نے مل کر قرارداد پاس کی ہے کہ کشمیر ہمارا اٹوٹ انگ ہے نیز بھارتی حزب اختلاف کے لیڈر نے جنیوا میں وفد کی قیادت کی ہے۔ جنیوا قرارداد پر اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے جناب شامی نے کہا کہ اس معاملے میں بھارت اور پاکستان دونوں کو ناکامی ہوئی ہے۔ بھارت کی ناکامی یہ ہے کہ وہ کشمیر کو بند نہیں رکھ سکا اور پاکستان کی ناکامی یہ ہے کہ کسی ملک کی

کموڈور طارق مجید: حوصلے پست نہ ہونے دیئے جائیں۔ مسئلہ کشمیر کا حل جہاد ہے۔

جناب طارق مجید نے کشمیر میں یہودی سرگرمیوں اور بھارتی خفیہ ایجنسیوں سے ان کے گہرے رابطوں کا ذکر بھی کیا جن کی شہادتیں بین الاقوامی میڈیا سے بھی ملتی ہیں۔ اور آخر میں اپنی گفتگو کے حاصل کے طور پر مسئلہ کشمیر کا حل جہاد کو قرار دیا۔ ان کے نزدیک یہ جنگ ناگزیر ہے نیز اس جہاد میں افغان مجاہدین کو بھی ساتھ ملایا جا سکتا ہے۔

سیمینار کے اگلے مقرر جناب محمود مرزا تھے۔ انہوں نے اپنی بات کا آغاز ہی طارق مجید صاحب کی اس تجویز کو رد کرتے ہوئے کیا کہ کشمیر بزور شمشیر بھارت سے چھینا جا سکتا ہے۔ آپ نے کہا کہ پھر تو بھارت بھی پاکستان سے کشمیر کا دوسرا حصہ بزور شمشیر چھیننا چاہئے گا۔ آپ نے مسئلہ کشمیر کے حل کو پاکستان کے استحکام اور خوشحالی کے لئے ضروری قرار دیا اور کہا کہ مسئلہ کشمیر کا حل جو بھی ہو لیکن آزاد کشمیر، مقبوضہ کشمیر اور وادی کے لوگوں کو مطمئن کرنا ضروری ہے اور یہ بھی کہ برصغیر کے عوام کو اپنے وسائل فوج

محمود مرزا: فوج، حزب اقتدار و اختلاف اور تمام سیاسی جماعتوں کو مل بیٹھ کر کشمیر پر ایک پالیسی بنانی چاہئے۔

مجیب الرحمٰن شامی: جنیوا میں پاکستان نے کچھ کھویا نہ بھارت نے کچھ پایا۔

مثبت تائید حاصل نہیں کر سکا تاہم کسی ملک نے پاکستان کے خلاف بھی بات نہیں کی۔ کشمیر میں مغربی سفیر اور ریڈ کراس کو جانے کی اجازت مل گئی ہے۔ مقبوضہ کشمیر میں ریڈ کراس کا وفد اس وقت بھی موجود ہے۔ اپنی گفتگو کے آخر میں انہوں نے کہا کہ جہاں تک تعلق ہے ثقافتی یلغار کا تو امریکہ اور بھارت دونوں برابر ہیں۔ جہاں تک تعلق ہے امریکہ کا' وہ جغرافیائی اعتبار سے ہم سے اتنا دور ہے کہ عملاً ہم پر قبضہ نہیں کر سکتا جبکہ بھارت کر سکتا ہے لہٰذا ہمیں امریکہ کو بھارت پر ترجیح دینی چاہئے۔

سیمینار کے اگلے مقرر جمعیت علماء اسلام فضل

حافظ حسین احمد: ہماری خارجہ پالیسی ہمیشہ "خارج" میں تیار ہوئی۔

الرحمٰن گروپ کے مرکزی رہنما' ایک دینی و علمی خانوادے کے چشم و چراغ سینیٹر حافظ حسین احمد تھے۔ حافظ صاحب ایک مرتبہ قومی اسمبلی کے رکن اور دو دفعہ سینٹ کے رکن منتخب ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی پارٹی کے پاس امور خارجہ کمیٹی کی سربراہی بھی ہے لہٰذا ان سے کچھ "اندر" کی باتیں سننے کی توقع تھی اسی لئے محترم جنرل انصاری صاحب نے ان کو دعوت خطاب دیتے ہوئے کہہ دیا تھا کہ ہمیں اندرون خانہ جو ہنگامے برپا ہیں' ذرا ان سے بھی آگاہ کیجئے۔

حافظ صاحب نے اپنی گفتگو کے آغاز میں ہی اس حقیقت کا اعتراف کر لیا کہ ہماری خاجہ پالیسی شاید "خارج" میں بنتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہماری خارجہ پالیسی کا قبلہ پہلے قادیانی وزیر خارجہ سر ظفراللہ چوہدری کے زمانے سے ہی درست نہیں ہے اور حکومت پاکستان ہر دور میں اس مسئلہ کو حل کرنے میں ناکام رہی ہے۔ کشمیر میں اٹھنے والی تحریک آزادی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ آج مسئلہ کشمیر کے عالمی سطح پر ابھرنے کا سہرا کشمیری مجاہدین کے سر ہے' اس میں نہ نواز شریف کا کوئی کردار ہے نہ ہی بے نظیر صاحبہ کا۔ مسئلہ کشمیر کے ضمن میں امریکہ کے کردار کا ذکر کرتے ہوئے حافظ صاحب نے فرمایا کہ وہاں انصاف کے پیمانے مختلف ہیں۔ ایک طرف ڈیڑھ سو افراد کے انسانی حقوق کا ڈھنڈورا پیٹ رہا ہے جبکہ فلسطین میں ساٹھ سال سے انسانی حقوق پامال ہو رہے ہیں لیکن امریکہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ حافظ حسین احمد نے کہا کہ آج جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ امریکہ کے بغیر مسئلہ کشمیر حل ہو ہی نہیں سکتا انہیں چاہئے کہ وہ امریکہ کو خوش رکھیں اور مسئلہ کشمیر سے دستبردار ہو جائیں۔ حافظ صاحب نے خارجہ پالیسی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ کسی بھی دور میں خارجہ پالیسی بناتے ہوئے پارلیمنٹ کو اعتماد میں نہیں لیا گیا۔ اس ضمن میں انہوں نے صومالیہ میں فوج بھیجنے کا حوالہ دیا کہ نواز شریف صاحب نے جب فوج بھیجی تب بھی پارلیمنٹ کو اعتماد میں نہیں لیا اور اب اس میں اضافہ کرتے ہوئے بے نظیر بھٹو نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔

محترم حافظ صاحب نے کہا کہ مسئلہ کشمیر کا کوئی بھی حل نکالا جائے' کشمیری عوام کو ضرور شریک کیا جانا چاہئے۔ اس ضمن میں انہوں نے جنیوا معاہدے کا ذکر کیا جس میں افغانستان کے عوام کو شامل نہیں کیا گیا تھا۔ حافظ صاحب نے اپنی تقریر کے آخر میں فرمایا کہ **اقوام متحدہ امریکی مفادات کا محافظ ہے۔ ان کے نزدیک مسئلہ کشمیر کا حل صرف جہاد ہے نیز علماء اور دینی جماعتوں کا اتحاد بہت ضروری ہے۔**

سیمینار کے آخری مہمان مقرر جناب زیڈ اے سلہری تھے۔ جناب زیڈ اے سلہری معروف صحافی' دانشور اور اول و آخر مسلم لیگی سوچ کے حامل ہیں۔ سلہری صاحب اپنی پیرانہ سالی اور ضعف صحت کے باوجود سیمینار میں شریک ہوئے جس سے ان کی کشمیر اور پاکستان سے بے لاگ محبت کا اندازہ ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی گفتگو کے آغاز میں کہا کہ مسئلہ کشمیر کا حقیقی تصور بس پشت ڈال دیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسئلہ کشمیر کشمیریوں کا مسئلہ نہیں ہے۔ بلکہ پاکستانیوں کا مسئلہ ہے۔ اس وقت سارا زور اس بات پر صرف ہو رہا ہے کہ کشمیریوں پر ظلم ہو رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ تحریک آزادی اور ظلم تو لازم و ملزوم ہے۔ اصل مسئلہ کشمیریوں کی مظلومیت کا نہیں ہے

زیڈ اے سلہری: کشمیری مسلمانوں کو مظلوم مت کہو' وہ تو مجاہد ہیں اور جہاد ٹھنڈے ٹھنڈے سے نہیں ہوا کرتا۔

کیونکہ وہ تو بہادر ہیں' اصل مسئلہ یہ ہے کہ پاکستان اس جنگ میں کیا کردار ادا کر رہا ہے۔

جناب سلہری نے جنیوا قرار داد کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اس سے ہمارا تنا ہونا الم نشرح ہو گیا

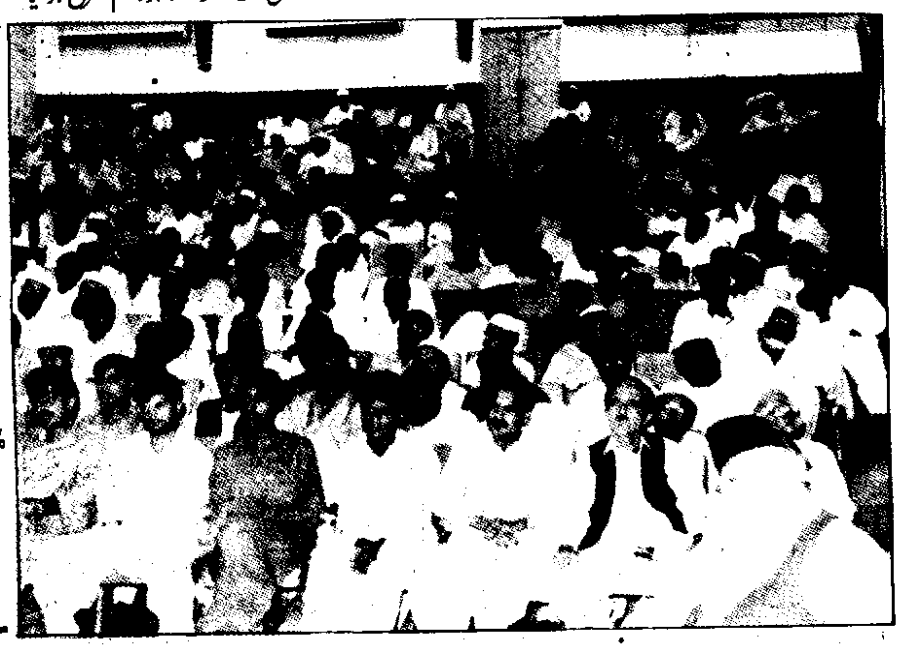

ہے۔ امریکہ کو جنیوا میں ہماری کمزوری کا اندازہ ہوگیا ہے اس لئے وہ اب مختلف تجاویز پیش کر رہا ہے۔ بین الاقوامی سطح پر یہ تنہائی کے علاوہ اندرون ملک بھی حزب اختلاف اور حزب اقتدار کی جنگ جاری ہے۔ انہوں نے کہا کہ مغرب روحانی طور پہ پیاسا ہے لہٰذا ہمارے علماء دین کو مغرب اور امریکہ میں جاکر تبلیغ کا فریضہ سرانجام دینا چاہئے۔ انہوں نے علماء کو سیاست میں ملوث نہ ہونے کا مشورہ دیا ہے۔

آخر میں صدر مجلس' امیر تنظیم اسلامی و داعی تحریک خلافت پاکستان جناب ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ نے صدارتی خطاب فرمایا۔ آپ نے شروع میں سورۃ المائدۃ آیت ۵۱ کی تلاوت کی۔ وہ آیت مبارکہ یہ ہے "یاایھا الذین امنوا لا تتخذوا الیھود والنصری اولیاء بعضھم اولیاء بعض" "اے ایمان والو مت دوست بناؤ یہود اور نصاریٰ کو' یہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ اس آیت کے حوالے سے آپ نے کہا کہ نزول قرآن کے وقت اس کی حیثیت ایک پیشین گوئی کی تھی اس لئے کہ اس وقت یہود و نصاریٰ کے درمیان کوئی دوستی نہ تھی جبکہ آج یہ امر واقعہ ہے۔ یہود و نصاریٰ کی یہ دوستی اس صدی میں ہوئی ہے۔

امیر محترم نے قیام پاکستان کے حوالے سے دانیال لطیفی صاحب کے ایک انٹرویو کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ برصغیر کی تقسیم نہ قائداعظم چاہتے تھے اور نہ گاندھی ہی بلکہ یہ انگریز کی سازش تھی۔ اس کے علاوہ یہ حقیقت بھی ناقابل تردید ہے کہ قائداعظم ہندو مسلم اتحاد کے سفیر سمجھے جاتے تھے اور کیبنٹ مشن پلان کی تائید بھی کرچکے تھے۔ چنانچہ انگریز نے

ڈاکٹر اسرار احمد جنہوں نے صدارتی خطبے میں ایک مکمل تقریر کی۔

ٹھونسا تھا یا نہیں لیکن ہم یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ پاکستان ہم پر اللہ نے ٹھونسا ہے۔ ہم نے بڑے عہد و پیمان کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے ایک آزاد ملک مانگا تھا اور اللہ کی سنت ہے کہ وہ وعدوں کے بدلے مانگی ہوئی نعمتیں بندوں کو ضرور عطا کرتا ہے تاکہ پھر یہ دیکھے کہ بندے اپنا عہد و پیمان کس حد تک نبھاتے ہیں۔ قیام پاکستان کے مقاصد کا ذکر کرتے ہوئے خطبہ الہ آباد کے حوالے سے کہا کہ علامہ اقبال کے نزدیک نئی مسلم ریاست کو ایک ماڈل ہونا تھا جو اسلام کے رخ روشن سے دور ملوکیت کے پردے ہٹاکر عہد حاضر میں اسلام کی اصل تعلیمات کا ایک نمونہ پیش کردے۔ اس ضمن میں امیر محترم نے قائداعظم کے اس مشہور قول کا حوالہ بھی دیا جس میں انہوں نے کہا تھا کہ ہم پاکستان اس لئے چاہتے ہیں تاکہ اسلام کے اصول اخوت و حریت و مساوات کا ایک عملی نمونہ پیش کرسکیں۔ زیڈ

اے سلہری صاحب کی اس بات پر کہ علماء کو یورپ میں تبلیغ کرنی چاہئے' تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ نوع انسانی ماڈل کے لئے ترس رہی ہے ہمیں پہلے اپنے ملک میں ایک مثالی اسلامی ریاست قائم کرنا ہوگی۔

امیر محترم نے کہا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم دنیا میں تنہا رہ گئے ہیں لیکن یہ تنہائی اللہ کی طرف سے ہے۔ ہم نے اس ملک میں قانونی اور دستوری سطح پر سود جیسی لعنت کو جاری رکھا ہوا ہے اور شریعت ایکٹ میں سیاسی و دستوری نظام کو قرآن و سنت سے بالاتر قرار دیا ہے۔ اس وعدہ خلافی کی پاداش میں ہم تنہا ہوئے ہیں۔ خارجہ پالیسی کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ یہ وہی ہے جو خواجہ ناظم الدین کے دور میں تھی کہ چونکہ ہمیں بھارت کا سامنا ہے جس کے مقابلے کی ہم میں سکت نہیں لہٰذا مجبور ہیں کہ امریکہ کے گھڑے کی مچھلی بنے رہیں۔ ہمیں خارجہ پالیسی کو نئے سرے سے مرتب کرنا ہوگا اور یہ کام گہرے غور و فکر کا متقاضی ہے۔ امریکہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ امریکہ انسانی حقوق کا محافظ نہیں ہے بلکہ یہودیوں کے حقوق کا محافظ ہے۔ امیر محترم نے سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے یہودیوں کے عزائم کا ذکر بھی کیا۔ انہوں نے کہا کہ مسجد اقصیٰ کو یہودی جلد منہدم کردیں گے۔ اس کے نتیجے میں شدید ہنگامہ ہوگا اور عرب نوجوانوں کو جن میں بنیاد پرستی کے جراثیم موجود ہیں' عرب ممالک کے حکمران بھون ڈالیں گے۔ ان تمام واقعات کے لئے سٹیج پوری طرح تیار ہوچکا ہے۔ عربوں کے لئے شدید عذاب کا وقت قریب ہے۔ عرب ممالک میں سے کسی نے بھی اسلام کی طرف پیش رفت نہیں کی۔ عربوں کے بعد پاکستان سب سے بڑا مجرم ہے۔ ہم نے اسلام کے نام پر خونی لکیر کھنچوائی تھی لیکن اسلام کا جو حشر ہم نے کیا وہ سب کے سامنے ہے۔ اس وقت نظام خلافت وقت کی اہم ضرورت ہے۔ دنیا کو سعودی ماڈل پسند نہیں چونکہ اس کی بنیاد بادشاہت ہے۔ ایرانی ماڈل اس لئے پسند نہیں کہ اس کی بنیاد تھیاکریسی ہے۔ امیر محترم نے کہا کہ نیوورلڈ آرڈر کی ہم نے ہر صورت میں مزاحمت کرنی ہے کیونکہ اس کی آڑ میں صیہونیت کا سیلاب پورے کرۂ ارض کا معاشی استحصال کرنا چاہتا ہے۔

امیر محترم نے کہا کہ ہمارے قومی مفاد کا تقاضا ہے کہ امریکہ کے حلقۂ اثر سے نکل کر مشرق کے اس بلاک کا حصہ بننے کی تجویز پر غور کریں جو ایران کی طرف سے آئی ہے۔ اہل تشیع میں کم از کم مجھے کوئی

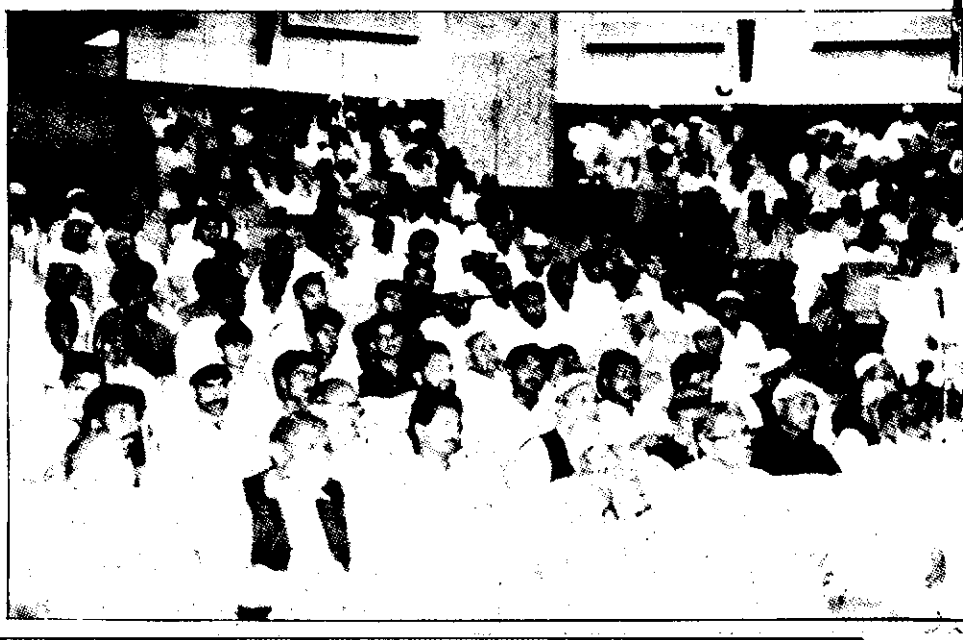

کشش محسوس نہیں ہوتی بلکہ دنیا جانتی ہے کہ میں ان کا ایک ہدف بنا رہا ہوں اسی طرح مجھے خوب اندازہ ہے کہ مجوزہ بلاک میں شامل ہونے کے لئے بھارت سے جو مفاہمت و مصالحت ضروری ہوگی اس کی طرف اشارہ کر کے میں ہر طرح کے الزامات کو دعوت دے رہا ہوں لیکن ملک و قوم کی خیر خواہی میں مجھے کسی ملامت کا خوف نہیں۔ میری درخواست ہے کہ اس موضوع پر غیر جذباتی انداز میں غور و فکر اور گفت و شنید کا دروازہ کھولا جائے۔ کہ بھارت کے ساتھ نفرت و عداوت پچھلی ایک صدی میں ہماری قومی نفسیات کا حصہ بن چکی ہے جو بلاشبہ خود ہندوؤں کے اپنے ہی کرتوتوں کی پیدا کردہ ہے لیکن ہمارا اپنا قصور یہ ہے کہ ہم نے بھی ان کا ذہن سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ ایک طویل عرصہ ان پر حکومت کرتے ہوئے ہم نے اپنے ایوان تو سجائے لیکن ان کا دل جیتنے کی کوئی تدبیر نہ کی ورنہ ہرگز ممکن نہ تھا کہ وہاں کی نچلی ذاتوں سے تعلق رکھنے والی اکثریتی آبادی میں آج ڈھونڈے سے بھی کوئی ہندو مل جاتا۔ آپ نے کہا کہ صنم خانہ ہند میں اسلام کی جتنی کچھ روشنی پھیلی وہ صوفیائے کرام کی کوششوں کا نتیجہ تھی ورنہ ہمارے حکمرانوں کا طرز عمل تو وہی رہا جس کی جھلک آج بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ کیا بھٹو نے تاشقند کے راز اور ہندوستان سے ایک ہزار سال تک لڑنے کے نعرے کو اقتدار تک رسائی کے لئے صرف زینہ کے طور پر ہی استعمال نہیں کیا؟ اور کیا کشمیر کا مسئلہ کرسی اقتدار کے دعویدار دو کھلاڑیوں میں گیند نہیں بن گیا ہے؟۔

مزید اضافہ کیا کہ امریکہ کو یہ موقع نہیں دیا جانا چاہئے کہ اس خطے کے ایک ایک ملک کو الگ الگ معاملہ کر کے اپنے جال میں پھنساتا چلا جائے۔ ہماری خارجہ پالیسی تو جا کر امریکہ کا دروازہ کھٹکھٹانے تک محدود ہے جیسے ملا کی دوڑ مسجد تک البتہ چین، بھارت اور ایران اگر نئے عالمی استعمار کو للکارنے کی ہمت کریں تو ہمیں اپنی آواز ان کی آواز میں شامل کر دینی چاہئے۔ انہوں نے کہا کہ کشمیری مسلمانوں نے خون دے کر پوری دنیا کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے۔ یہ بات اب ثابت ہو چکی ہے کہ بھارت کسی بھی قیمت پر کشمیر کو اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا اور جیسا کہ اندازہ ہو گیا ہے اسے بھی یہ منظور نہیں کہ اپنے محل وقوع کے اعتبار سے حد درجہ اہم یہ علاقہ بذریعہ اقوام متحدہ امریکہ کے ہتھے چڑھ جائے چنانچہ وہ خود پاکستان کے ساتھ مذاکرات کے لئے کسی ایسے بہانے کی تلاش میں ہے جس میں اس کی زیادہ خفت نہ ہو۔ کہ بھارت میں بھی ایک مضبوط حزب اختلاف ہے اور ہندو بنیاد پرستی نے وہاں بھی جنم لے لیا ہے جس کا سامنا کرنے کے لئے اگر ہم اسے کوئی آڑ فراہم کر سکیں تو مفاہمت کے راستے کھلتے چلے جائیں گے جبکہ حالات کی نزاکت اور اس کے بدلتے ہوئے تیور سمجھنے میں ہم سے کوتاہی ہوئی تو پانی سر سے گزر جائے گا۔ انہوں نے واضح کیا کہ نہرو خاندان کے زوال کے بعد بھارت میں بڑی بنیادی تبدیلیاں آ چکی ہیں۔ وہاں ملک کی زمام کار متعصب برہمنوں اور پنڈتوں کے ہاتھوں سے نکل گئی ہے اور بعض بڑے صوبوں میں تو نچلی ذات کے ہندو بھی برسر اقتدار آ گئے ہیں۔ ہمارے دانشوروں کو شاید ہی معلوم ہو کہ آر ایس ایس کے گرو کے منصب پر بھی اب ایک راجپوت فائز ہے۔ آخر میں کہا کہ بھارت سے مفاہمت و مصالحت کی بات چھیڑ کر میں نے بڑے شدید مخالفانہ ردعمل کا خطرہ مول لیا ہے لیکن پاکستان کے مسلمانوں کو یاد رکھنا چاہئے کہ صلح حدیبیہ میں ہمارے لئے ابدی رہنمائی موجود ہے کہ کسی وقتی مصلحت کے تحت کچھ دب کر صلح کر لینے کا نتیجہ بھی وہ ہو سکتا ہے جسے خود قرآن حکیم نے فتح مبین قرار دیا۔

امیر محترم نے بعض مقررین کے خیالات پر تبصرہ بھی کیا۔ مثلاً جہاد افغانستان پر تبصرہ کرتے ہوئے جس کا تذکرہ حافظ حسین احمد، کموڈور طارق مجید اور سلہری صاحب نے کیا تھا، امیر محترم نے کہا کہ جہاد افغانستان میں اصل جنگ امریکہ نے ہلدی آڑ میں لڑی ہے جس کا فائدہ بھی امریکہ کو ہی ہوا ہے، ہمارے ہاتھ تا حال کچھ نہیں آیا۔ حافظ حسین احمد صاحب کی اس بات پر کہ ہمارے اختیار میں کچھ نہیں ہے، تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ اگر آپ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے تو پھر وہاں بیٹھنے کی آخر ضرورت کیا ہے؟ اس سیاست کے کھیل پر تین حرف بھیج کر کسی انقلابی جدوجہد میں کیوں نہیں شریک ہو جاتے لیکن شاید چھٹتی نہیں ہے یہ ظالم منہ سے لگی ہوئی۔ اس پر قرآن آڈیٹوریم کا ہال تالیوں سے گونج اٹھا اور دیکھا گیا کہ حافظ حسین احمد صاحب کے چہرے پر خفت آمیز ہنسی تھی۔ تالیاں پٹنے کا اس ہال میں پہلا اور تا حال واحد واقعہ تھا اور نہیں کہا جا سکتا کہ سامعین کے کس حصے نے اس میں پہل کی۔ یہ بات البتہ طے ہے کہ یہ کام تنظیم اسلامی اور تحریک خلافت سے تعلق رکھنے والے حاضرین کا نہیں تھا جو قرآن آڈیٹوریم کے ادب و آداب سے خوب واقف ہیں۔OO

بقیہ: خطاب جمعہ

جانا چاہئے کیونکہ کسی وقت دب کر بھی صلح کر لی جاتی ہے جو بعد میں فتح عظیم میں بدل جاتی ہے۔ حیات طیبہ ﷺ میں صلح حدیبیہ اس کی روشن ترین مثال ہے لیکن محسوس یہی ہو رہا ہے کہ ایسا بھی نہ ہو سکے گا اور یہ غور و فکر اور مکالمے کی مختصر مہلت بھی ہماری سہل انگاری و تن آسانی کی نذر ہو جائے گی یعنی ہم اسی تنخواہ پر کام کرنا اور نیو ورلڈ آرڈر کی غلامی ہی کو باقاعدہ قبول کر لیں گے۔ اس میں تاریخی تسلسل بھی ہے اور ہمیں اپنے مہربان و مربی عرب ملوک و شیوخ کی خوشنودی بھی حاصل رہے گی۔ پانی آخر تو نشیب کی طرف بہتا ہے!۔

ایک تیسرا راستہ بھی موجود تو ہے!

ایک تیسرا راستہ ہمیں کلام ربانی دکھا رہا ہے اور لگتا ہے جیسے سورۃ المائدہ کی آیات ۵۱، ۵۲ آج کے حالات میں دراصل ہمارے لئے نازل فرمائی گئی تھیں۔ "اے ایمان والو! یہود اور نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ، یہ ایک دوسرے کے دوست ہیں اور تم میں سے جو لوگ ان سے دوستی بڑھاتے ہیں تو گویا وہ انہی میں سے ہیں، اللہ ظالموں کی قوم کو ہدایت نہیں دیتا۔ پھر (اے نبی ﷺ) آپ دیکھیں گے کہ جن (مسلمانوں) کے دلوں میں (نفاق کا) روگ ہے وہ ان (یہود و نصاریٰ) میں گھسے پھرتے ہیں، کہتے ہیں کہ ہمیں خوف ہے کہیں کوئی مصیبت نازل ہو کر ہمیں گھیر نہ لے سو یہ تو ہو سکتا ہے کہ اللہ (آپ کو) کامیابی سے ہمکنار کر دے یا اس کا (کوئی دوسرا) فیصلہ آ جائے اور ان لوگوں کا یہ خفیہ گٹھ جوڑ ظاہر ہو اور وہ اپنے دلوں میں شرم و خجالت کی کیفیت میں مبتلا ہو کر رہ جائیں"

واقعہ یہ ہے کہ نزول قرآن کے وقت یہود و نصاریٰ میں دوستی اور تعاون کی فضا موجود ہی نہ تھی اور اللہ تعالیٰ کا یہ انتباہ فی الحقیقت ایک پیش گوئی کی حیثیت رکھتا تھا جو آج بکمال و تمام پوری ہو کر ہمارے سامنے آ گئی ہے۔ اور ضمناً دیکھئے کہ یہود و نصاریٰ کی تولیت کے حصول میں بھاگ دوڑ اور اپنے تحفظ کے لئے ان میں گھسے چلے جانے کی بات موجودہ عرب حکمرانوں پر کیسے صادق آ رہی ہے! فھل من مدکر!!

اس تیسرے راستے کو اختیار کرنے کے لئے اللہ

(باقی صفحہ ۳۴ پر)

پاک بھارت مفاہمت امریکہ کے مفاد میں نہیں

برصغیر "ایٹمی جنگ" سے بچ سکے گا؟

عبدالکریم عابد

دانشوروں اور مذہبی رہنماؤں کی نئی ذمہ داری جسے ادا کرنا وقت کا تقاضا ہے

پاکستان کی ہر حکومت نے امریکہ کو اپنا قبلہ و کعبہ جانا اور امریکی بلاک کے زیر سایہ ہی ہم سانس لیتے رہے ہیں حالانکہ ہمارا عوامی مزاج ہمیشہ سے فرنگی اور سامراجی اقتدار کے خلاف رہا ہے لیکن اس مزاج کے باوجود "ہندو خطرہ" کے احساس نے کانگریس کے مقابلہ میں مسلم لیگی لیڈروں کو برطانیہ کے زیادہ قریب کیا۔ سرسید، وقار الملک، آغا خان نے ہی نہیں قائداعظم مرحوم نے بھی مسلم سیاست کے لئے سروں خان بہادروں نوابوں کو قیمتی اثاثہ خیال کیا اور انہی کے ذریعے مسلمانوں کی قومی سیاست کو آگے بڑھایا۔ قیام پاکستان کے موقع پر لیاقت علی خان نے برطانیہ کو چھوڑ کر امریکہ سے رابطہ قائم کیا اور پھر ہم دن بدن امریکہ کے زیر سایہ ہوتے چلے گئے جس کی وجہ صاف تھی کہ ہمارے سیاسی لیڈر اور بیوروکریٹ دونوں بھارت سے خوف زدہ تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہم بھارت کا مقابلہ نہیں کر سکتے ہمیں کسی کی پناہ حاصل کرنا چاہئے اور یہ پناہ امریکہ نے فراہم کی تو ہماری دلی مراد بر آئی اور یکے بعد دیگرے حکومتیں آتی جاتی رہیں لیکن ہر حکومت نے اپنا قبلہ و کعبہ امریکہ کو ہی سمجھا۔ لیاقت علی خان، اسکندر مرزا، غلام محمد، ایوب خان، بھٹو، ضیاء الحق، بے نظیر، نواز شریف سب نے امریکہ کی مدد سے اقتدار حاصل کیا اور جب تک اقتدار پر رہے امریکی آشیرواد کے ساتھ رہے۔ اگر کسی کی امریکہ سے کچھ کھٹ پٹ ہو گئی تو اسے اقتدار سے جانا پڑا اور بیچارے ضیاء الحق تو اس ضمن میں جان سے بھی گئے۔

ان سب لیڈروں کی اور پاکستان کی امریکہ سے وابستگی کی وجہ وہ نہیں تھی جو ہمارے بائیں بازو کے دانشور پیش کرتے رہے کہ یہ لیڈر حضرات سامراجی ایجنٹ تھے اور پاکستان چونکہ رجعت پسندی اور سامراجیت کی طاقت نے بنایا اس لئے وہ سامراج کا حاشیہ بردار بھی رہا۔ اس کے برعکس امریکی بلاک سے وابستگی پر عوام اور خواص میں دکھ اور شرمندگی کا احساس ہمیشہ موجود رہا لیکن اس کو مجبوری خیال کیا گیا کہ بھارت کے جارحانہ عزائم سے بچاؤ کا کوئی اور راستہ نہیں سوائے اس کے کہ ہم امریکی چھتری تلے آ جائیں۔ خاص طور پر جب یہ بھی نظر آ گیا کہ روسی سپرپاور بھی بھارت کی پشت پر ہے تو ہمارا خوف زدہ ہو جانا اور امریکہ کی طرف کھسکتے چلے جانا بالکل فطری تھا۔ بائیں بازو کے دانشوروں نے اس پر پاکستان اور پاکستانی لیڈروں کو ہمیشہ مطعون کیا اور ہر ممکن طعنہ زنی وہ کرتے رہے مگر ۵۰ء میں ہی جے پرکاش نرائن نے یہ صحیح تجزیہ پیش کر دیا تھا کہ نہرو کی مخالف پاکستان سیاست اور دھمکی آمیز انداز پاکستان کو امریکہ کی طرف لے جا رہا ہے اور اس سلسلہ میں قصور وار بھارت ہے جس نے جارحانہ روش اختیار کی ہے حالانکہ اسے پاکستان کو اپنا دوست اور ساتھی بنانے کی کوشش کرنی چاہئے تھی اور اس کے لئے ضروری ہے کہ پاکستان کے دل سے بھارت کا خوف دور کیا جائے مگر نہرو اور کانگریس پاکستان کو مزید خوف زدہ کر رہے ہیں۔

یہی بات کٹر ہندو ہونے کے باوجود مرارجی ڈیسائی بھی کہتے رہے لیکن وہ لوگ جن سے برصغیر میں امن اور بھائی چارہ کو فروغ دینے کے لئے جدوجہد کی امید تھی، وہ دونوں ملکوں کے درمیان عناد کو فروغ دیتے رہے۔ ان میں کمیونسٹ اور سیکولر حضرات پیش پیش رہے جنہوں نے پاکستان دشمنی کو سوشلزم اور سیکولرازم کی ایمانیات کا جزو لازم سمجھا حالانکہ یہ لوگ اگر پاک بھارت مفاہمت کے لئے کام کرتے تو آج برصغیر کی فضا مختلف ہو سکتی تھی مگر ہم دیکھتے ہیں کہ بھارت میں کمیونسٹوں نے مہاسبھا اور کانگریس کی پاکستان دشمنی پر صاد کیا اور نہرو کی پاکستان دشمن پالیسیوں پر صاد کرنے والی سب سے بڑی شخصیت کمیونسٹ رہنما ڈانگے اور جوشی کی تھی۔ ان کے زیر اثر پاکستان کا ترقی پسند طبقہ بھی یہ سمجھ بیٹھا کہ پاکستان دشمنی ان کے مذہب و مسلک میں اساسی حیثیت رکھتی ہے۔

اس طرز عمل کے دو اسباب تھے، ایک یہ خیال کہ پاکستان نے چلنا چلانا نہیں ہے دوسرا یہ کہ روس اور امریکہ کی سرد جنگ میں پاکستان کی جانبداری کی وجہ سے پاکستان روسی نقطہ نظر سے مغضوب اور ملعون قرار پایا تھا۔ "ترقی پسندوں" نے اس روسی فتویٰ کو سر آنکھوں پر رکھنا ضروری سمجھا اور پاکستان دشمنی میں آسمان سر پر اٹھا لیا۔ وہ اپنی ترقی پسندی اور اپنے سیکولر ہونے کی بنا پر پاک بھارت مفاہمت کے لئے بہت کچھ کر سکتے تھے مگر انہوں نے نہ صرف یہ کہ ایسا نہیں کیا بلکہ ان کا رد عمل اس کے برعکس ـــــ رہا حالانکہ پاکستان کو امریکی حاشیہ برداری سے نکالنے کے لئے اس کے خوف کو سمجھنا دور کرنا اور ایک نئی فضا پیدا کرنا ضروری تھا۔ یہ کام بھارت اور پاکستان میں کہیں نہیں ہوا، سب نے اسی خوف کو ہوا دی اور اب بھی ہوا دیئے چلے جا رہے ہیں۔

برصغیر میں کمیونسٹوں کے علاوہ ایک چھوٹا سا مگر اہم عنصر صحیح اسلامی سوچ کے علمبرداروں کا تھا جس نے اول روز سے ہندوستانی قومیت کے پردہ میں چھپی

ہوئی ہندو بالادستی کی خواہش کو سمجھا اور اس کی مخالفت میں اہم کردار ادا کیا لیکن یہ اسلامی نقطہ نظر مسلم فرقہ پرستی یا مسلم قوم پرستی کا بھی حامی نہیں تھا اور سمجھتا تھا کہ اس سے اسلام کی راہ میں کانٹے بوئے جائیں گے اور خود مسلمانوں کا مفاد تہس نہس ہوگا۔ اس اسلامی عنصر سے یہ امید تھی کہ وہ برصغیر کو ہندو مسلم عصبیت کی جاہلی جنگ سے بچانے کے لئے پاکستان میں ایک خاص کردار ادا کرے گا اور ابتدا میں یہ کردار ادا بھی کیا گیا لیکن افسوس اور دکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ اس اسلامی عنصر پر بھی مسلم قوم پرستی کا وہ رنگ غالب آگیا جس کی مذمت مولانا مودودی نے مدلل اور موثر انداز میں کی تھی۔ آپ اس کی ذمہ داری بھی بھارت کے لیڈروں پر ڈال سکتے ہیں کہ وہ منہ پھاڑے پاکستان کو کھا جانے کے لئے آگے بڑھ رہے تھے لیکن بہرحال اس پس منظر میں پاکستان میں جو قومی نفسیات بنی اس سے پاکستان کے اسلامی عناصر بھی اپنے آپ کو الگ نہیں رکھ سکے۔ یہ ایک بدقسمتی کی بات تھی اور اس سے بھی زیادہ بدقسمتی کی بات یہ ہوئی کہ اسلامی عناصر بھارت دشمن ذہنیت کی علامت اور اس کے سب سے بڑے ترجمان بن گئے۔ اس کے جواز اور حق میں بہت سی باتیں کہی جاسکتی ہیں لیکن ایک تو اس سے سارا اصولی نظریاتی موقف اور تشخص درہم برہم ہوگیا دوسرا پاکستان کے مذہبی حلقوں کے بارے میں یہ خیال کیا جانے لگا کہ ہندوستان کی ہندو مہاسبھا کے جواب میں یہ مسلم مہاسبھا قسم کی کوئی چیز ہے اور اس تاثر کے نتیجے میں نہ صرف غیر مسلم بلکہ خود مسلمانوں میں اسلامی دعوت کی صحیح بین الاقوامی اور بین الانسانی اساس اور بنیاد نظروں کے سامنے قائم نہیں رہ سکی۔

پاکستان کے لئے بلا شبہ یہ مسئلہ روز اول سے اولین اہمیت کا حامل رہا ہے کہ بھارت کے جارحانہ عزائم سے ہم اپنے آپ کو کیسے بچائیں۔ مسلم لیگی رہنماؤں اور پاکستان کے بیوروکریٹک اقتدار نے اس مسئلہ کا حل یہ دریافت کیا کہ اپنے آپ کو امریکہ سے باندھ لو اور امریکہ بھارت کے آگے روک بنا رہے گا۔ سرد جنگ کے دنوں میں یہ پالیسی کامیاب بھی رہی اور آج بھی واقعہ یہ ہے کہ پاک بھارت جنگ کے راستے میں امریکہ ہی رکاوٹ ہے ورنہ امریکہ کی آشیرواد سے بھارت نے جس طرح پہلے پاکستان کو دولخت کیا' اب بھی پارہ پارہ کرنے کے لئے آگے بڑھ سکتا ہے مگر ایک تو امریکہ نے روک لگا رکھی ہے دوسرا یہ کہ ہمارے پاس ایٹمی صلاحیت آگئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پاکستان کے پاس چھ یا بارہ ایٹم بم ہیں یا ایک بھی نہیں ہے مگر ان کا مصالحہ بلوچستان میں کسی جگہ تیار ہے اور اس مصالحہ سے فی الفور ایٹم بم تیار کئے جاسکتے ہیں اور انہیں استعمال کرنے کے لئے وسائل بھی موجود ہیں۔ یہ بات بھی واضح ہوگئی ہے کہ امریکہ کی تمام تر تابعداری کے باوجود ہمارا کوئی بھی مقتدر گروہ امریکہ کے کہنے پر اس ایٹمی صلاحیت سے دستبرادی کے لئے تیار نہیں ہے تاوقتیکہ بھارت بھی اس دستبرداری پر تیار نہ ہو اور یہ بھی واضح ہوگیا ہے کہ بھارت امریکہ کے سخت مطالبے کے باوجود پاکستان کے ساتھ ایٹمی دستبرداری کے باہمی معاہدہ پر تیار نہیں۔

پاکستانی سیاسی رہنماؤں اور سول فوجی بیوروکریٹس رہنماؤں کے لئے امریکہ کی ایٹمی خواہشات کے آگے جھکنا ممکن نہیں ہے۔ جنرل عبدالوحید کے حالیہ دورہ میں بھی یہ بات کھل کر سامنے آگئی ہے۔ پاکستانی رہنما اور ان کا مقتدر افسر طبقہ جس حد تک امریکہ کی بات مان سکتا تھا' اس نے بات مان لی۔ ان کی یہ تجویز ہے کہ ہم بھارت کے ساتھ مل کر ایٹم سے دستبرادی پر رضامند ہیں' معنی یہ ہیں کہ وہ اس بات کو بھی قبول کرنے کے لئے تیار ہیں کہ بھارت علاقے میں ایک بالادست قوت ہے۔ اس کا نیا بیس فی صد زائد مالیت کا جنگی بجٹ' اس کی نئی طاقتور بحریہ اور اس کے پرتھوی اگنی میزائل اس کی بالادستی کو ظاہر کرتے ہیں مگر پاکستان کے لئے اطمینان کی بات اس کی ایٹمی صلاحیت ہے کہ اگر ایٹم بم خواہ گنتی کے چند ہوں مگر مقابل کی فوجی بالادستی کو بے معنی بنادیتے ہیں۔

ایٹمی جنگ کے لئے آگے بڑھنا کھیل نہیں ہے مگر جب پاکستان بھارت سے مل کر اس ایٹمی صلاحیت سے دستبرداری پر تیار ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ بھارت کی روایتی فوج اور روایتی اسلحہ میں جو برتری ہے وہ قائم رہے گی اور پاکستان کو رہنے کے لئے اپنے سے زیادہ طاقتور' ایسا ہمسایہ منظور کرنا ہوگا جس سے وہ خوف زدہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں اس کی بھی مخالفت پائی جاتی ہے کہ بھارت کے ساتھ مل کر ہم ایٹمی دستبرداری اختیار کریں کیونکہ اس دستبرداری کے نتیجہ میں بھارت کی روایتی اسلحہ کی فوجی برتری قائم رہے گی بلکہ زیادہ ہوجائے گی کیونکہ امریکہ بھارت کو اس معاہدہ پر مائل کرنے کے لئے جدید طیاروں کی ٹیکنالوجی بھارت کو اپنے اور اس کی اسلحہ سازی کی صنعت کو جدید کمپیوٹر فراہم کرنے کے لئے تیار ہے۔ ایٹم کا معاہدہ نہ ہونے اور ہوجانے کی شکل میں پاکستان اور بھارت کے درمیان فوجی توازن کو ہم کیسے برقرار رکھ سکتے ہیں' یہ مسئلہ سنجیدہ سوچ کا متقاضی ہے۔ اگر بھارت اور پاکستان میں ایٹمی دوڑ رہتی ہے تو ان کی اقتصادیات اس کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ اب تک تو دونوں کو اس معاملہ میں سوپر پاور نے چھوٹ دے رکھی تھی' اس چھوٹ کا اب خاتمہ ہوچکا ہے۔ امریکہ ڈنڈا لے کر کھڑا ہے کہ ایٹم بموں اور میزائلوں کے خاتمے کی طرف کچھ پیش رفت کرو ورنہ اقتصادی پابندیوں کے لئے تیار ہوجاؤ۔

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

ایک ٹینک یا سو پرائمری سکول؟

یہ سوچنے کی ضرورت ہے کہ اس سلسلہ کو کہاں تک بڑھایا جاسکتا ہے کہ ایک ہتھیار ہم نے حاصل کیا تو پاکستان نے اس سے بہتر ہتھیار حاصل کرلیا۔ پاکستان نے کوئی ہتھیار حاصل کیا تو بھارت کو اس سے بہتر ہتھیار حاصل کرنے کی فکر لاحق ہوگئی۔ اس دوڑ سے ہم ایٹمی ہتھیاروں کی تیاری تک جاپہنچے لیکن یہ سلسلہ یہاں بھی نہیں رکے گا' ایٹمی ہتھیاروں کے بعد ایٹمی ہتھیاروں کو استعمال کرنے کے لئے آلات و اختیارات درکار ہوں گے۔ پھر ان میں مقابلہ جاری رہے گا اور ہمیں یہ نہیں معلوم ہے کہ نہ تو سیاسی طور پر نہ اقتصادی طور پر ہم اس کے متحمل ہوسکتے ہیں نہ ہی یہ دوڑ ہم اپنے بل بوتے پر جاری رکھ سکتے ہیں۔ اس کے لئے دوسروں کی محتاجی بھی جاری رہے گی اور اس بات کا بھی امکان نہیں کہ دونوں ملکوں میں کوئی فیصلہ کن جنگ ہوسکتی ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ ہم پاکستان کو صفحہ ہستی سے مٹادیں یا پاکستان ہمیں صفحہ ہستی سے مٹادے گویا جس راستے پر ہم جارہے ہیں اس پر چلتے ہوئے کسی حتمی حل تک پہنچنا ناممکن ہے اور جہاں تک وسائل کے ضیاع کا تعلق ہے تو ہم جو کچھ ایک ٹینک پر خرچ کرتے ہیں اس سے سو پرائمری سکول قائم ہوسکتے ہیں۔ (سابق وزیراعظم بھارت وی پی سنگھ کے انٹرویو کا ایک اقتباس)

حکیم سعید سابق گورنر سندھ کا مرثیہ

گورنر کا حقہ پانی بند ہوا' گورنر ہاؤس مقروض ہو گیا

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد یقیناً قیام پاکستان کے حق میں نہیں تھے۔ اپنے دلائل میں وہ مضبوط تھے اور پورے استحکام کے ساتھ یہ رائے رکھتے تھے کہ تقسیم ہند درحقیقت برصغیر کے عظیم مسلمانوں کی تقسیم کے منصوبے کا نام ہے جو بہرحال مسلمانوں کے ضعف پر منتج ہو گا۔

جب پاکستان بن گیا تو ان کی رائے تھی کہ انگریز اپنے منصوبے میں تقسیم فلسطین کے بعد ہندوستان میں تقسیم مسلم میں کامیاب ہو گیا ہے۔ مگر اب حضرت مولانا قیام پاکستان کے بعد استحکام پاکستان کے لئے دعاگو تھے۔ بہ ایں ہمہ ان کی حتمی رائے یہ تھی اور اس کا اظہار انہوں نے برملا کیا اور کرتے رہے کہ "مجھے جو پریشانی ہے وہ یہ ہے کہ پاکستان میں جو عناصر آج جمع ہیں کل وہ صوبائی عصبیتوں کے نرغے میں آ جائیں گے اور ان کا یکجا رہنا ہمیشہ معرض خطر میں رہے گا۔"

حضرت مولانا آزاد نے اپنی اس رائے کا کبھی اخفا نہیں کیا کہ پاکستان کی توانائی کی عمر زیادہ سے زیادہ پچیس سال ہے۔ اس سے پہلے اور اس کے بعد مختلف عصبیتیں جنم لیں گی اور انتشار پیدا ہو گا جو افتراق پر منتج ہو گا۔ مجھے یقیناً حضرت مولانا کی رائے سے اتفاق نہیں تھا۔ صحیح تر یہ کہ حضرت محترم کے دلائل و براہین پر یقین کرنے کو میرا دل نہیں چاہتا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد وہ ہندوستان سے مسلمانوں کی ہجرت کے حق میں نہیں تھے۔ ان کی رائے میں ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے یہ ہجرت باعث ضعف ہو گی۔ بہ ایں ہمہ ان کا دل اس خدشے سے خالی نہ تھا کہ اس ہجرت کی کثرت سے پاکستان کے لئے مسائل پیدا ہوں گے۔ ۱۹۴۸ء میں ایک قافلے سے انہوں نے دہلی میں خطاب بھی کیا اور فرمایا کہ یہ ہجرت اس اعتراف کی نفی ہے کہ تمہارے آباؤ اجداد نے گنگا اور جمنا کے پانیوں سے وضو کیا تھا۔ اس خطاب میں بھی انہوں نے انہی خدشات کا اظہار فرمایا کہ پاکستان تقسیم در تقسیم کے نہایت دردناک خطرات سے دوچار ہو جائے گا۔

آج جب میں پاکستان کو پیش آمدہ مسائل پر سوچتا ہوں اور یہاں کے نہایت انسانیت سوز اور اخلاق سوز حالات پر غور کرتا ہوں تو میرا کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ٹھیک ۲۴ سال بعد مشرقی پاکستان کٹ کر الگ ہو گیا اور بنگلہ دیش بن گیا۔ تقسیم پاکستان کا نہایت الم ناک حادثہ اور سانحہ پیش آیا تو ٹھیک اس دن کہ جب سقوط ڈھاکہ ہوا مغربی پاکستان میں کاروبار زندگی معمول کے مطابق جاری تھا۔ شادیوں اور دیگر تقاریب کی محافل گرم تھیں اور پاکستان کے مراعات یافتہ طبقوں کے فکر و نظریہ تھے (جنہیں پاکستان نے بہت کچھ دیا تھا) کہ مشرقی پاکستان مغربی پاکستان پر ایک بار عظیم تھا۔ اچھا ہوا کہ اس سے نجات ملی۔ اب مغربی پاکستان ترقی کرے گا۔ ہائے' کس قدر دردناک ہے یہ کوتاہی فکر کہ دس کروڑ اپنے بھائی الگ ہو کر اغیار کے رحم و کرم پر چلے گئے اور ارباب حل و عقد کی آنکھ میں آنسو نہ آیا۔ کسی ایک دل نے غور نہ کیا کہ تاریخ اسلام کا یہ نہایت خطرناک سانحہ ہے جس کے اثرات دور رس ہوں گے اور مغربی پاکستان جسے "نیا پاکستان" کہا گیا اس میں انتشار اور افتراق کے وہ بیج پڑ جائیں گے جو کل یہاں تقسیم در تقسیم کا عنوان بن جائیں گے۔ دیکھئے کہ اب "نیا پاکستان" لسانی عصبیتوں' فکری توانائیوں' علاقائی الجھنوں میں گرفتار ہو چکا ہے۔ صوبائی آزادیوں کی باتیں ہو رہی ہیں۔ "ہم ایک ہیں" کا نعرہ یا یعنی ہو کر رہ گیا ہے۔ قرآن و حدیث اور اسلام کی تمام تعلیمات بے اثر ہو گئی ہیں اور برملا کہا جاتا ہے کہ یہ طاقت اسلام' پاکستان کو اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہنے کے لئے کمزور ہو چکی ہے اور اس میں انتشار و افتراق کو روکنے کی موثر توانائی باقی نہیں رہی ہے۔

اب ہم پورے تیقن کے ساتھ یہ حکم لگا سکتے ہیں کہ ہمارا مجتمع رہنا جب ممکن نہیں رہا ہے تو یقیناً اس کا باعث یہ ہے کہ ہم نے قرآن کو فراموش کر دیا ہے اور سنت رسولؐ سے صرف نظر کر لیا ہے۔ نہ صرف ہمارا انتشار اور افتراق اس حقیقت پر دال ہے بلکہ من حیث القوم ہمارے اخلاق میں جو شدید انحطاط اور زوال آیا ہے اس نے ملت پاکستانیہ کے تانے بانے بکھیر کر ڈال دیئے ہیں۔ قناعت کو ترک کر کے ہوس دولت کی دوڑ نے ہمیں دنیا بھر میں عنوان نفرت بنا دیا ہے۔

سندھ کے تناظر میں سب سے سنگین اور دردناک حالات یہ ہیں کہ شہر ہوس کہ دیہات' یہاں قرآن کی قبولیت کم زور تر پڑ چکی ہے۔ اس کے دو بدیہی اسباب ہیں ایک یہ کہ سندھ میں ہند کے اثرات کا نفوذ پورے تسلسل کے ساتھ جاری و ساری رہا ہے۔ اب سندھ ہو کہ پورا پاکستان ان اثرات کا ہدف اول قرآن حکیم رہا۔ مسلمان کو اس سے دور کر دینے کی حکمت عملی اسلام اور مسلمان کے خلاف نہایت مستحکم عالمی مغربی و مشرقی سازش کا بین حصہ ہے۔ ایشیا میں ایک ہمسایہ ملک' جس نے دوستی کا ہر ہاتھ جھٹک دیا ہے' اس کا مرکز ہے جب کہ ایک ازلی دشمن اور اس کے مغربی اور مشرقی مفکر ہیں اور پرجوش حامی بھی۔ یہ کوئی راز نہیں ہے کہ اندرون سندھ متعدد علاقوں میں قرآن پڑھنا ممنوع رہا ہے۔ قرآن کی بے حرمتی کے واقعات جو بڑی یکسانیت رکھتے ہیں ان کا ظہور ایک عام بات ہے۔ اس صورت حال کا دوسرا سبب یقینی طور پر علمائے کرام کی بے توجہی اور صریح بے عملی ہے۔ ہمارے واجب الاحترام علمائے کرام جو بجا طور پر مزاج امہ میں دخیل ہونے کے دعوے دار ہیں' خود قرآن و سنت کے پیرو نہ رہے۔ اس لئے ان کے مواعظ اس درجہ بے اثر ہوئے کہ ہندی اور مغربی تہذیبی یلغاروں کے آگے ماند پڑ گئے۔ بلاشبہ پاکستان میں علمائے کرام فکر عوام پر اثر انداز ہوئے ہیں۔ عوام کے مزاج اور ان کے فکر و عمل پر علمائے کرام کی مضبوط گرفت تھی۔ مگر یہ گرفت اب اس لئے ڈھیلی پڑ رہی ہے کہ خود علماء کا عمل قرآن و سنت کے اتباع سے خارج ہوتا جا رہا ہے۔ اور اب نوبت یہ آ چکی ہے کہ پارلیمان ملی میں پاکستان کی متعدد دینی جماعتوں کی

ایم کیو ایم کے قائد جناب الطاف حسین کے ایک مکتوب مفتوح کا مکمل متن قومی اخبارات میں شائع ہو چکا ہے جس میں انہوں نے ملک کی اعلیٰ ترین عسکری قیادت کو براہ راست مخاطب کر کے سندھ میں "مہاجرین" کے ساتھ گزشتہ دو برسوں میں روا رکھے جانے والے سلوک کا ذکر کرنے کے بعد اصلاح حال کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اسی پس منظر میں رکھ کر حکیم محمد سعید صاحب کی یہ تحریر پڑھئے جو روزنامہ نوائے وقت لاہور کی اشاعت یکم اپریل میں ادارتی صفحہ پر موجود تھی۔ حکیم صاحب نے فی الحقیقت پاکستان کا ایک مرثیہ کہا ہے جس میں ان کے احساس اور رنج والم کی شدت تو پوری طرح موجود ہے لیکن تشخیص و تجویز کی وہ شان نہیں پائی جاتی جس کی ان سے بجا طور پر امید تھی۔ ہم اپنے پرچے میں حکیم صاحب کے مرثیے کو اس خیال سے دہرا رہے ہیں کہ ایسی تحریروں پر اخبارات کے قارئین کی نظریں اکثر اوقات ٹھہرتی ہی نہیں۔۔۔۔۔۔۔ ادارہ

نمائندگی صرف آٹھ اراکین کرتے ہیں جب کہ غیر مسلم اقلیتوں کی نمائندگی پارلیمان میں اس وقت نو ہے۔ علمائے کرام کا پاکستان میں منتہائے مقصود تہذیب و تمدن اسلامی کا بقا نہ رہا اور ثقافت اسلامی کو دم توڑتے ہوئے دیکھ کر بھی ان کی توجہ اس طرف نہ ہو سکی۔ علمائے کرام بلا استثنا فرقہ سازیوں اور فرقہ بازیوں میں اس شدت سے مصروف ہوئے ہیں کہ حقیقت اسلام کے ادراک سے محرومی ان کا مقدر ہو گئی۔ مساجد میں تالے جب دشمنوں کے ہاتھوں لگوائے تو پاکستان میں دل مسلم خون خون ہو گیا۔ خود پاکستان میں اختلافات میں جو کثرت و شدت ہے اس نے علماء و مشائخ کے خلاف ایک مضبوط صف بندی کر دی ہے جسے دشمنان اسلام اپنے لئے فال نیک قرار دے رہے ہیں۔

قیام پاکستان کے وقت سندھ نے نہایت محبت کے ساتھ اپنا آغوش وا کیا تھا اور مسلمانان سندھ نے مدینہ منورہ کے مہاجر و انصار کا بہترین نمونہ پیش کیا تھا۔ یہ وہ جذبہ تھا کہ اس کی مسلسل آبیاری پر توجہ کی ضرورت تھی' کیوں کہ اس کے حریف موجود تھے اور ان کو یہ گوارا نہ تھا کہ مہاجر و انصار شیر و شکر ہو جائیں۔ ان کی حکمت عملی یہ تھی کہ اگر سندھ کی شکر مہاجر دودھ میں گھل گئی یا مہاجر کی شکر سندھ کی کھیر میں مل گئی تو وہ اپنے اپنے وجود کو کیسے برقرار رکھیں گے۔ یہ وہ تکیہ کلام (سلوگن) تھا جس کا نوٹس کسی نے نہیں لیا۔ زار روس نے "ترکی مغرب کا مرد بیمار" کہا۔ اس نے یہ ایک ایسا سلوگن دیا تھا جو آج بھی ترکی پر چسپاں ہے۔ قیام پاکستان کے بعد اسی قسم کا ایک سلوگن سندھی اور مہاجر کو دیا گیا' بلکہ مہاجر کو کہا گیا کہ "سندھی اور سانپ دونوں مل جائیں تو پہلے سندھی سے نمٹو۔" اس نہایت تباہ کن تکیہ کلام نے جڑیں پکڑ لیں۔ حزب اقتدار میں اور صاحبان صحافت و سیاست میں کوئی ایک ماہر نفسیات نہ تھا جو اس سلوگن کی سمیت کو سمجھ سکتا۔ حکومت اس وقت خطرناک تکیہ کلام کی معنویت کے ادراک سے یکسر محروم رہی۔ فقط اس ایک سلوگن نے کراچی کے مہاجر کو خصوصاً اور سندھ کے دوسرے مہاجروں کو عموماً احترام سندھی سے محروم کر دیا حتیٰ کہ مہاجر نے عظیم سندھی انصار کے ہر احسان کو فراموش کر دیا۔ یہ وہ حالات تھے کہ دشمن بیرونی طاقت نے موقع پا کر گیسوں کی امداد' بہ عنایت گسترانہ کے سہارے اور دولت کی یلغاروں سے امت مسلمہ پر بھرپور وار کیا اور ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ کم از کم شہر کراچی کا سکون تہ و بالا رہے اور یہاں امن و امان برقرار نہ رہے۔ کراچی شہر کو بدحالی کے حوالے کر دینا دشمنان اسلام کی سب سے اہم حکمت عملی تھی۔

گزشتہ ۴۸ سال میں شدت اور کثرت کے ساتھ یہ حالات طاقت حاصل کرتے رہے اور کوئی ایک رہنما اس فکر کی توڑ پھوڑ کا مداوا کرنے کا اہل ثابت نہ ہو سکا۔ اس لئے کہ وہ خود سندھ میں ہو کہ بلوچستان میں' پنجاب میں ہو کہ سرحد میں اسی شکست و ریخت کی گرفت میں ہے اور اپنی ذات سے باہر آ کر دیکھنے کا اہل نہیں رہا ہے۔ علمائے کراچی خصوصاً اور واجب الاحترام علمائے پاکستان باہم جنگ و جدل میں مصروف ہو گئے اور ان کو تبلیغ و تصلیح کے لئے اندرون سندھ اور بیرون سندھ توجہ کی فرصت ہی نہیں ملی' یہاں تک کہ وہ خود فسادات باہم سے نبرد آزمائی کے قابل بھی نہ رہے اور ان کے دینی اثرات بہ منزلہ صفر رہ گئے ہیں۔

ایک نہایت اہم اور قابل توجہ الیہ صحافت پاکستان کا بہ حیثیت مجموعی کمزور پڑ جانا ہے۔ ایک طرف وہ سیاست ہے کہ جس کا مقصود ایک دن تعمیر ملک و قوم نہ رہا اور دوسری طرف وہ صحافت جس کا کوئی دین رہا اور نہ ایمان۔ سیاست اور صحافت یہ دو نہایت طاقت ور عنوان ہیں جن کے اضمحلال سے پاکستان میں ضعف فکر و نظر پیدا ہوا ہے۔ سیاست' سیاست کار کی ذات میں محدود ہو کر رہ گئی۔ وہ سندھ میں کیا پورے پاکستان میں ذاتی نفع اندوزیوں میں مصروف ہوئی اور اسے تعمیر کا کوئی خیال نہ رہا۔ اور پھر اس سیاست نے مہاجر و انصار کے مابین افتراق کو اپنی فکری اور عملی جولانیوں کا مرکز قرار دے دیا۔ اب اس نہایت دردناک اور نہایت افسوس ناک صورت حال پر قدغن صحافت لا سکتی تھی مگر اس رنگ برنگ صحافت کے سامنے نظریہ حیات ملی کا حفظ و بقاء نہ رہا۔ صحافت نے بھانت بھانت کی بولیاں بولنی شروع کر دیں اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ اس صحافت کے شکار فقط اخبارات ہی نہیں ہیں الیکٹرانک میڈیا بھی ہے۔ اس پر مستزاد دوسرے ذرائع ابلاغ کے ذریعہ سے مغربی تہذیب کی شدت یلغار نے تہذیب و تمدن ملت کے تانے بانے بکھیر دیئے ہیں۔

اس صورت حال نے پاکستان میں آزادی سے محبت کا قحط ڈال دیا ہے۔ آج صورت حال یہ ہے کہ پاکستان میں کوئی ایک فرد محب وطن موجود نظر نہیں آتا ہے اور آزادی کی رکھوالی کا کوئی تصور باقی نہیں رہا ہے۔ صاحبان فکر و قلم کی خاموشیاں' اہل علم و ادب کی بے فکریاں' صاحبان سیاست و صحافت کی بے راہ رویاں اور صاحبان اقتدار کی مجبور صرف نظریاں آخر کار ایک ایسا طوفان کرب و بلا لا چکی ہیں جس کا مقابلہ کرنا اب بے حد مشکل ہو گیا ہے۔ شدید اخلاقی زوال نے ہر دشمن کو بھرپور موقع دے دیا ہے کہ وہ حالات کو تہ و بالا کر دے۔ دردناک صورتحال اب یہ ہے کہ اس تباہ کاری پر بندھ باندھنے کا یارانہ محراب و منبر کو رہا اور نہ شاعر و ادیب کو اور نہ اصحاب و سیاست کو۔ فقط سندھ نہیں پورا پاکستان اس زوال کی گرفت میں ہے۔ اس زوال کا مظاہرہ قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں میں دیکھنا چاہئے۔

سندھ میں آج بھی حکومت عملاً اہل سندھ کی ہے۔ میں اصولاً اور اپنی فکری افتاد کے اتباع میں اس کے حق میں ہوں کہ اہل سندھ کو حق حکومت حاصل ہے۔ اس استحقاق کے بعد' جو اسے ہر طرح حاصل ہے' اصولاً اس حکومت کو انصاف پسند ہونا چاہئے۔ اس کو اسلام کی تعلیمات کی پیروی میں مسلمان کو مسلمان کا غلام بنانے کی روش سے گریز کرنا چاہئے' بلکہ اسے گناہ قرار دینا چاہئے۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ میں خوب جانتا ہوں اور سب جانتے ہیں کہ سندھ کی کوئی حکومت معیار اسلام پر آج تک پوری نہیں اتری ہے۔ میں اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہوں کہ غیر ملکی زبردست طاقتوں نے اپنی نہایت نپی تلی حکمت عملی سے مہاجر کو ظالم و جابر بنا کر اسے انصار کے مدمقابل لا کر کھڑا کر دیا ہے اور ساتھ ہی اس کی فکری و اخلاقی پسپائیوں کا انتظام کر دیا ہے۔ اس صورتحال نے اہل سندھ کی حکومت کے مزاج کو اور شدت دے دی ہے۔ یہ شدت اب نفرت سے بدل چکی ہے۔ حکومت سندھ جن سیاست کاروں کے ہاتھ میں رہی ہے ان کی انسان سے محبت اور انسان کے احترام سے محرومی' مقدر رہی ہے۔ نفرت نے ان کو سنگ دل حریف بنا دیا ہے۔ بہ حیثیت مجموعی سندھ کا سکون تباہ و برباد ہو چکا ہے۔ انتہا یہ ہے کہ مہاجر گورنر کا حقہ پانی بھی بند ہوا ہے اور گورنر ہاؤس مقروض ہوا ہے۔ بے فکری کی یہ وہ معراج ہے جو تباہی اور بربادی کو لازمی بنا دیتی ہے۔

میں پاکستان میں مغربی جمہوریت کے حق میں نہیں ہوں' اور نہ ہو سکتا ہوں۔ میں اسے سم قاتل سمجھتا ہوں۔ ہمیں جس قدر جلد ممکن ہو اس نابکار اور ناہنجار جمہوریت سے نجات حاصل کرنے کی جدوجہد کرنی چاہئے اور اسلامی شورائی نظام حکومت کی جس قدر جلد ممکن ہو طرح ڈالنی چاہئے۔ اگر فقط سندھ کی بات کریں تو اس نظام کی ترتیب و تنظیم میں شورائیت فکر اسلامی کو پوری جگہ دیکر اہل سندھ کو مسند صدارت دینی چاہئے اور پھر قرآن و سنت کی تعلیمات کو اصول حکومت قرار دینا چاہئے۔ شورائی نظام حکومت کو قرآن و سنت کا کاملاً اتباع کرنا چاہئے۔ ہر ہوش مند انسان فکری اور ذہنی طور پر اپنے ہر حق سے دست بردار ہونے میں اطمینان محسوس کرے گا۔ میں نومبر ۱۹۸۸ء کے انتخاب کے حق میں نہیں تھا۔ میں نے یہی کہا تھا کہ نومبر ۱۹۸۸ء کے انتخابات پاکستان کو فکری طور پر صوبوں میں تقسیم کر دیں گے۔ جناب محمد خان جونیجو جیسے معتدل مزاج انسان کی حکومت کو خاموش کر دینا یقیناً ایک غیر صحیح عمل تھا۔ اس کا علاج صرف اور صرف یہ تھا کہ خاموش کردہ پارلیمان ملی کو بحال کر دیا جاتا۔ مگر ایسا نہیں ہوا اور اعتراف کرنا چاہئے کہ پاکستان میں فکری تقسیم عمل میں آ چکی ہے جو اب جغرافیائی تقسیم پر منتج ہو سکتی ہے اگر پاکستان میں طرز حکومت کو شورائیت کا اسلامی نظام دینے میں تاخیر کی گئی۔ ہر ہیئت حاکمہ نے پورے ۴۸ سال تک انسان پاکستان کو تعلیم سے محروم رکھا ہے اور تعلیم کو اور تعلیم کے ہر فنڈ کو' حتیٰ کہ زکوٰۃ اور اقراء ٹیکس کو سیاست پر قربان کیا ہے۔ پاکستان میں عورت کو تعلیم سے باز رکھا ہے۔ یہ سوچی سمجھی اسکیم پاکستان کی عسرت کا عنوان بنی۔ عورت جب تعلیم یافتہ ہوتی ہے تو پھر خاندان تعلیم یافتہ ہوتا ہے۔ ہم پاکستان کے ایسے حاکموں کو آج بھی جانتے ہیں جن علاقوں میں درس گاہیں قائم کرنا ممنوع ہے۔ ایسے

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

صدارتی نظام پر ڈاکٹر اسرار احمد کا اصرار

ایک جوابی تحریر جس کا ادارتی قطع و برید نے حلیہ بگاڑ دیا

موقر روزنامے "نوائے وقت" میں پچھلے دنوں محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی طرف سے صدارتی نظام حکومت اور چھوٹے صوبوں کے حق میں کہی ہوئی بات پر بہت ناگواری کا اظہار ہوا۔ پہلے ایک شذرے میں ان کے موقف کے علاوہ خود ان کی ذات کا بھی خاکہ اڑایا گیا اور چند دنوں بعد اس کے ایک فاضل کالم نویس نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ جواب میں چند سطریں نوائے وقت کے مدیر اعلیٰ کی خدمت میں ارسال کی گئی تھیں جنہیں ۲۹ مارچ کی اشاعت میں شامل تو کر لیا گیا ہے لیکن قطع و برید کے ذریعے انہیں گویا KILL کر دیا گیا۔ ہم بہرحال محترم مجید نظامی صاحب کے اتنے تعاون کا بھی شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنے قارئین کی خدمت میں اصل متن پیش کر رہے ہیں تاکہ جن ساتھیوں نے نوائے وقت میں وہ تحریر پڑھ کر تشنگی محسوس کی ہے' ان کی تو کچھ تشفی ہو۔۔۔۔۔۔۔۔ مدیر

اقتدار احمد

"صدارتی نظام پر ڈاکٹر اسرار احمد کا اصرار" کے عنوان کے تحت پروفیسر محمد سلیم صاحب کی تحریر (نوائے وقت ۸ مارچ) پر نظر پڑی تو خیال گزرا کہ بزرگوارم چونکہ ایک عالم و فاضل اخبار نویس ہیں لہٰذا ڈاکٹر صاحب کی سیاسی تجاویز پر کوئی عالمانہ و فاضلانہ تبصرہ پڑھنے کو ملے گا لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ' کالمانہ پھبتیوں کے سوا اس میں استدلال نام کی کوئی شے ڈھونڈے سے بھی نہ ملی۔ معلوم ہوتا ہے کہ آج کل ملی صحافت کی روایات کے امین اس موقر روزنامے کے ادارۂ تحریر میں بعض شذرہ نویسوں کی ناک کی پھنگی پر غصہ دھرا رہتا ہے جو ظاہر ہے کہ بصورت نزلہ گرتا بھی عضو ضعیف پر ہے چنانچہ کسی طرح کی "یوتھ فورس" کی ضرورت محسوس نہ کرنے والے امیر تنظیم اسلامی و داعی تحریک خلافت یعنی برادر محترم ڈاکٹر اسرار احمد کی طرف سے قومی و ملکی معاملات پر کوئی رائے ۔۔۔ سامنے آئے تو کسی نہ کسی ادارتی ڈیسک سے ہانک سنائی دیتی ہے کہ "ارے غنچہ' ٹانا تو ذرا میرا قلمدان!"۔ چونکہ ابھی پچھلے ہی دنوں اسی موضوع پر ادارتی شذرہ لکھنے والے صاحب نے ڈاکٹر صاحب کی خبر لیتے ہوئے انہیں "پرچ ڈاکٹر" کی صحافتی گالی تک دے کر دل کی بھڑاس نکال لی تھی لہٰذا اس امید کا دوہرا جواز تھا کہ اب پروفیسر صاحب کی باتوں میں اپنے اخبار کے موقف کو دلیل و برہان کی کمک پہنچائی گئی ہوگی تاہم افسوس کہ اس بیچارے کی امید بر نہ آئی اور ان کے ملفوظات سے "فقہ کالیت" کے سوا کچھ بھی برآمد نہ ہوا۔ گویا انہوں نے اپنے کالم کے عنوان (فقہ کالم) سے معنوی مناسبت کو برقرار رکھنا ضروری سمجھا۔

جی میں آئی تھی کہ بروقت گزارش احوال واقعی کی جائے لیکن اسد اللہ خاں غالب کا ذاتی تجربہ یاد آگیا کہ ؎

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

سوچا کہ محترم کالم نویس کو غالب کی طرح فوراً نہیں تو کچھ دنوں بعد ذرا بڑے ہو کر ہی اندازہ ہو جائے گا کہ یہ جنوں اب صرف ڈاکٹر اسرار احمد ہی کو نہیں' ان کے اپنے کچھ ممدوح سیاست دانوں کو بھی ناحق ہو چکا ہے مستند ہے جن کا فرمایا ہوا۔ چنانچہ عبث انتظار رہا کہ اپنی غلیل سے وہ کچھ اور سروں کا بھی نشانہ لینے پر مجبور ہو جائیں گے جن کا جادو ان کے سر چڑھ کر بولتا ہے تو ہم بھی اپنی چوٹ کو سہلا کر درد کو بہلا لیں گے کہ مرگِ انبوہ جشنے دارد۔ اس دوران کتنے ہی حلقوں سے صدارتی نظام اور چھوٹے صوبوں کی تائید میں آواز بلند ہوئی لیکن یہ طوطیانِ صحافت منقار زیر پر رہیں تو اب سخن گسترانہ کچھ عرض کئے بغیر چارہ نہیں' منظور جس سے قطع محبت نہیں مجھے!۔

محترم کالم نویس اگر نصاب سے بڑھے ہوئے اپنے قیمتی وقت کی تھوڑی سی زکوٰۃ نکال کر ڈاکٹر اسرار احمد کے دو چار خطبات جمعہ اول تا آخر سن لیں تو اس خاکسار کو یقین ہے کہ وہ ڈاکٹر صاحب کو شگوفے چھوڑتے تو ہرگز نہ پائیں گے البتہ انفرادی و اجتماعی مسائل و معاملات سے متعلق کتاب و سنت کی روشنی میں کہی جانے والی "از دل خیزد' بر دل ریزد" قسم کی باتیں ضرور سنیں گے۔ ان باتوں کا معیار پروفیسر صاحب کے علمی قدو قامت سے بیک قدِ آدم کم تر تو ہو سکتا ہے کہ بہرحال فکر ہر کس بقدر ہمت اوست لیکن حوالہ ہدایت کے انہیں سرچشموں کا ہوگا جو سب مسلمانوں کے لئے حرف آخر کا درجہ رکھتے ہیں۔ ضمناً ان میں حسب موقع و محل قومی و سیاسی امور کا ذکر بھی آ ہی جاتا ہے کہ آخر ڈاکٹر صاحب اور ان کے سامعین بھی اسی ملت کا ایک حصہ ہیں' ہر فرد جس کے مقدر کا ستارہ ہوتا ہے۔ ملک میں سیاسی عدم استحکام اور آئے دن کے اتھل پتھل سے کس محب وطن کو تشویش نہیں ہوتی؟ اور حب وطن کے جملہ حقوق آپ ۔۔۔ حضرات نے اپنے لئے محفوظ نہیں کرا لئے ہیں تو معاشرے کے کم از کم ان گنے چنے لوگوں کو تو جان کی امان کے ساتھ اذن کلام دیجئے جو اپنی بات شائستگی سے کہنے کا سلیقہ رکھتے ہیں اور ڈاکٹر صاحب کے سننے والوں کی اکثریت کا خیال ہے کہ وہ نہ صرف نظری سیاست کا ایک وسیع تر تناظر میں ادراک بلکہ حالات و واقعات کا قرآنی بصیرت کے تحت تجزیہ کرنے کی استعداد بھی رکھتے ہیں تاہم آپ کے لئے ان باتوں کو رد کرنا ضروری ہو تو دلیل کو دلیل سے کاٹئے' آوازے کسنے سے تو خود لذتی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔

ڈاکٹر صاحب اللہ تعالیٰ کی حاکمیت علیا و تامہ کے تحت نظام حکومت کے لئے پارلیمانی سسٹم کو بھی اسلام میں حرام تو کیا مکروہ بھی قرار نہیں دیتے' ان کا کہنا صرف یہ ہے کہ صدارتی نظام اسلام کے اس حکومتی بندوبست کے لئے پارلیمانی نظام کے مقابلے میں موزوں تر محسوس ہوتا ہے جس کا عام فہم نام خلافت ہے اور ملک میں پارلیمانی نظام کے کھیل میں حصہ لئے بغیر اس کا بے ٹکٹ تماشہ دیکھتے تنگ آ کر اب انہوں نے اپنی قوم سے سوال کیا ہے تو کیا برا کیا کہ موجودہ نظام حکومت میں آخر اس کے سوا کون سی خوبی ہے کہ یہ ہمیں انگریز آقا کی وراثت میں ملا۔ اس کی اپنی مجبوری تو یہ تھی کہ اپنے ہاں بادشاہت کا وہ روائتی چڑیا گھر بھی اگر بند کر دے جس میں ایک سنہرہ پنجرہ بادشاہ یا ملکہ کے لئے مخصوص ہے جو مر کر بھی نہیں مرتا یا مرتی تو سیاح وہاں کیا دیکھنے جوق در جوق آئیں گے۔ رہی یہ بات کہ حضرت قائد اعظم نے اس کو اختیار کیا تھا تو ان کے خلوص و اخلاص پر ذرہ برابر بھی شک و شبہ رکھے بغیر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ انہیں چونکہ معلوم تھا کہ نئی سیاست کی جو

تھوڑی بہت تربیت مسلمانان برصغیر کو مل سکی ہے وہ پارلیمانی نظام پر مشتمل ہے لہٰذا اسی مصالحہ کو انہیں نئی مملکت کی تعمیر میں استعمال کرنا پڑا۔ وہ خوب جانتے تھے کہ ان کی جیب میں جو کھوٹے سکے ہیں ان کے عوض کوئی بہتر تعمیری مواد موزوں تر نظام حکومت کے لئے خریدا نہیں جاسکتا۔ پھر یہ بھی تو خیال فرمایئے کہ انہیں اپنی ناپختہ کار اور شعور سے عاری قوم کو پارلیمانی نظام کی مٹی پلید کرتے دیکھنے کی مہلت ہی کتنی ملی' جو وہ صدارتی یا کوئی نظام نافذ کرنے کی بات سوچتے درآنحالیکہ اپنی حیات مستعار کی مہلت کے اختصار کے بارے میں وہ تو اپنے ہموطن معالجین سے یقیناً بہتر واقف تھے۔ اس راقم کو تو یہ بھی یقین ہے کہ حمید نظامی مرحوم نے بھی پارلیمانی نظام کے یہ تماشے دیکھ لئے ہوتے تو اس کے خلاف اٹھنے والی سب سے توانا آواز انہی کی ہوتی۔

اس تعریض میں صدارتی نظام کے حق میں دلائل دینا تو مقصود ہے نہ ممکن اور بالخصوص اب یہ ضروری بھی نہیں رہا کہ اس کی حمایت زبان خلق کی صورت میں نقارۂ خدا بنتی جاری ہے' بس اتنی سے بات کا اضافہ کرنا پڑے گا کہ آج پاکستان میں صدارتی نظام کے نفاذ کی راہ میں کم آبادی والے صوبوں کا یہ خوف بھی حائل ہے کہ پنجاب اپنی کثرت آبادی کے بل پر قصر صدارت کو اپنے باوا کی جاگیر بنالے گا اور پروفیسر صاحب گردش ایام کو پیچھے کی طرف دوڑا کر ذرا تھکائیں تو وہ بھی ہاتھ جوڑ کر اس خوف کی طرف اشارہ کرتی نظر آئے گی جو قیام پاکستان کے بعد موجودہ پاکستان کے چاروں صوبوں کو مرحوم مشرقی پاکستان کے واحد صوبے سے تھا۔ اس کا توڑ صوبوں کی نئی حدبندی میں ہے۔ یہ اور بھی کتنے ہی عوارض کے ضمن میں پرہیز کا کام دے گا جو علاج سے ہمیشہ بہتر سمجھا گیا ہے۔ خدارا منہ نہ کھلوایئے' پنجاب کے ہمہ جہتی تفوق اور پنجابی کمانے والی فوج نے اب تک ملک کی سیاسی تاریخ میں کیا کیا گل نہیں کھلائے' کون سے سنگ ریزے ملک کی استحکام اور وحدت ملی کے پہلے سے خارزار راستوں میں نہیں بکھیرے۔ اہل دانش تو عقل سے پیدل لوگوں کی حماقتوں سے سیکھ لیتے ہیں' ہم کیوں اپنی فاش غلطیوں سے بھی کوئی سبق حاصل کرنے پر آمادہ نہیں؟۔ ہمیں بقول آپ کے نئے شگوفے چھوڑنے کا شوق ہے تو آپ بھی اسی سانپ کی لکیر پیٹتے رہنے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں جو ہمارے قومی افتخار کا کوہ نور ہیرا نگل کر نصف صدی پہلے یہاں سے نکل گیا تھا..... تم حسن میں' ہم عشق میں' مشہور ہیں دونوں..... کیوں نہ ایک دوسرے کا مذاق اڑانے کی بجائے مل بیٹھ کر سوچیں کہ طرز کہن پہ اڑنے اور آئین نو سے ڈرنے کی کٹھن منزل سر کرلینے میں ملک و قوم کا فائدہ زیادہ ہے یا نقصان زیادہ۔ کیوں زیاں کار بنیں' سود فراموش رہیں!۔

صوبوں کی یہ حدبندی جسے ہم تقدس دیئے بیٹھے ہیں' انگریز نے اپنی انتظامی سہولت کے لئے کی ورنہ پہلے تو موجودہ پورا پاکستان "سندھ" تھا اور پورا وسطی بھارت "ہند" کہلاتا تھا۔ صوبوں یعنی ولایات کی ہیئت جغرافیائی کے بارے میں بھی تذکروں میں بعض بڑے دلچسپ فقرے ملتے ہیں مثلاً ایک جگہ یوں مذکور ہے کہ لاہور کہ یک شہر در مضافات ولایت ملتان است۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے یہی تو کہا کہ تقریباً مساوی آبادی رکھنے والے نئے صوبے بنائے جائیں جو چھوٹے ہوں گے تو انتظام میں سہولت ہوگی اور ان کی تشکیل میں تہذیب و تمدن اور نسلی و لسانی حوالوں کو بھی ملحوظ رکھا جائے تو سونے پر سہاگہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں میں یہ بوقلمونی تعارف کے لئے رکھی ہے اور الگ الگ شالوں کی یہ نمائش وحدت دین و ملت کے وسیع تر شامیانے تلے عجب بہار دکھائے گی۔ خیال ہے کہ اس سے ہمارے بے شمار دلدر دور ہوجائیں گے تاہم اگر کسی کی زنبیل میں اس سے بہتر کوئی طلسمی پڑیا موجود ہے تو اسے ہوا میں ذرا اچھال کر تو دکھائے' ہمارے سر آنکھوں پر!۔

سینٹ کی کرسی صدارت پر اپنا امیدوار کامیاب کروالینے کے بعد میاں نواز شریف صاحب پر اب تو عالم سرخوشی طاری ہے لیکن تھوڑے ہی دنوں پہلے تک وہ پارلیمانی نظام سے بیزار بیٹھے تھے اور ایک بڑے اخبار میں ملک کے ممتاز و معتبر صحافی کی اس پر گواہی شائع ہوچکی ہے کہ ان کا ہدف اب براہ راست منتخب صدر کا عہدہ ہے۔ بین الاقوامی شہرت کے حامل معروف قانون دان جو آئینی و دستوری نکات پر باقاعدہ لکھتے ہیں اور کچھ ہی عرصہ قبل میاں صاحب موصوف کے غیر رسمی حلقہ مشاورت میں شامل ہوئے' اسی اخبار میں صاف لکھ چکے ہیں کہ "اس بات پر اب مخلصانہ طور پر سوچنا چاہئے کہ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ آئینی طور پر ہم اس نظام کو تبدیل کرکے ایک ایسے نظام کی طرف قدم بڑھائیں جس میں ایک براہ راست منتخب صدر اعلیٰ ترین تعلیم یافتہ افراد کی مدد سے ملک کو چلائے"۔ ایک معتدل مزاج سیاسی دانش ور جو پنجاب کا مقدمہ لڑنے میں پروفیسر صاحب سے کہیں زیادہ شیری کا مظاہرہ کرچکے ہیں' واشگاف الفاظ میں نئی حد بندیوں کے ساتھ چھوٹے صوبوں کی وکالت کرنے پر آگئے جس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ خود پنجاب کے حق میں سب سے زیادہ تکلیف دہ ہوگا۔ آئی ایس آئی کے سابق سربراہ نے جن کا خلوص اور اسلام و پاکستان سے غیر مشروط وفاداری ہمارے نزدیک شک و شبہ سے بالا ہے' پبلک پلیٹ فارم سے صدارتی نظام کے حق میں آواز اٹھائی ہے۔ مسلم لیگ (ن) کے چیف آرگنائزر اعجاز الحق صاحب کی طرف سے بھی پارلیمانی نظام سے مایوسی کے ساتھ صدارتی نظام کی خواہش کا اظہار ہوا ہے۔ ہاں' ایک محترم قاضی حسین احمد صاحب کو پارلیمانی نظام کی فکر کھائے جارہی ہے اور گستاخی معاف' اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ وہ پارلیمانی نظام کے ایوانہائے نمائندگان میں تو حصہ رسدی کچھ سیٹیں لے جاسکتے ہیں' صدارت کے عہدے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے۔ اب ہمارے بزرگوار کالم نویس فرمائیں کہ ان سب اکابرین و عمائدین کے سروں کی طرف کوئی پتھر تو کیا' ان کی چھنگلیا بھی نہیں اٹھی تو کیوں؟۔ آگے حد ادب!

پروفیسر صاحب کی بہت سی دیگر باتوں کا جواب دینے سے بات بڑھے گی اور اس کا فائدہ بھی ہرچند کہیں کہ ہے' نہیں ہے کیونکہ ہماری بدقسمتی کہ قومی مزاج سے افہام و تفہیم کی صلاحیت اور اس کے لئے ضروری وسعت ظرف رخصت پر جاچکی ہے البتہ برادر محترم ڈاکٹر اسرار احمد پر طنز و استہزاء کے جو تیر برسائے گئے ہیں' ان کے بارے میں صرف اتنا عرض کرنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ کیسے تیرانداز ہو' سیدھا تو کرلو تیر کو۔ ان کی دانش وری کا اچھا قائل ہونا ہوا کہ ملک کے سیاسی نظام کے بارے میں اپنی ماہرانہ رائے دینے سے باز رکھ کر آپ انہیں صرف قوم کی اخلاقی و دینی حالت سنوارنے کی کوشش پر لگا دینا چاہتے ہیں تاکہ وہ بھی بعض دوسرے لوگوں کی طرح بسم اللہ کے گنبد میں بند ہوکر رہ جائیں۔ آپ کے اس مشورے سے پہلے ہی ان کا اصل زور مسلمان بھائیوں کو اللہ اور اس کتاب کی طرف بلانے پر ہے جس کے بغیر اس قوم کی اخلاقی و دینی حالت سنور ہی نہیں سکتی لیکن اپنے وطن کے سیاسی نظام کو وہ بازیچہ اطفال یا کوئی شجر ممنوعہ سمجھنے لگیں تو یہ کیسی عقلمندی ہوگی کہ اسباب کی دیگ کو تو دم پخت ہونے کے لئے ڈھک کر وہ ہلکی آنچ پر رکھا رہنے دیں اور نتائج کی فکر میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھ کر دبلے ہوتے رہیں۔ دانشوری کا یہ نادر اور ماہرانہ انداز ہی تو وہ جہل خرد ہے جس نے قوم کو یہ دن دکھایا اور آپ کے معاشرے میں اسی صدری نسخے کے استعمال نے نوبت یہاں تک پہنچادی ہے کہ گھٹ گئے انساں' بڑھ گئے سائے!

پروفیسر صاحب! ڈاکٹر اسرار احمد جیسے گفتار کے غازیوں کی قدر کیجئے جن کی کردار سازی میں مروجہ سیاسی "غزوات" کا کوئی حصہ نہیں۔ ایسی آوازیں خاموش کرکے آپ دین و ملت کا درد رکھنے والوں کی زبان حال سے یہ سننے کی تاب کہاں سے لائیں گے کہ۔

سنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے
کفن سرکاؤ' میری بے زبانی دیکھتے جاؤ!!

اس بات پر دو برس بیت گئے ہوں گے کہ "زندگانی کی گزرگاہوں میں" کے عنوان سے میں نے اپنے کچھ ذاتی تجربات و مشاہدات لکھنے کا سلسلہ شروع کیا تھا جو بہت جلد منقطع ہوگیا۔ اس کا آغاز کرتے ہوئے وضاحت کردی تھی کہ یہ عنوان میں نے ملک نصراللہ خاں عزیز مرحوم سے مستعار لیا ہے جو پاکستان میں طرزِ قدیم کی صحافت کے آخری چراغ تھے۔ ۶۰۔۱۹۵۹ء میں چند ماہ میں نے ان کے ہفت روزہ "ایشیا" کی ادارت کے فرائض انجام دیئے اگرچہ میری حیثیت نائب مدیر کی اور شناخت قلمی نام "باسط بی۔اے" سے تھی۔ ان سے میری نیاز مندی کا تعلق بہت مختصر رہا لیکن اس شفقت کی حلاوت آج بھی یاد ہے جس سے مرحوم ملک صاحب نے مجھے نوازا تھا۔ اسی تعلق خاطر کی بنا پر میں نے ان کی تحریروں کے اس سلسلے کا عنوان اختیار کرلیا بظاہر جو آپ بیتی نظر آتی تھی لیکن اہل نظر کے لئے ان میں بڑے سبق موجود ہوتے۔

زندگانی کی گزرگاہوں میں حیاتِ دنیوی کی شامِ زندگی کی طرف سفر کرتے صبحِ دوامِ زندگی کو طلوع ہونے کے لئے قبر میں غروب ہونے تک ہر انسان کا واقعات و حوادث کے ایک تسلسل کے ساتھ واسطہ رہتا ہے جو اگر ضبطِ تحریر میں آجائے تو پڑھنے والوں کو اس سے کچھ حاصل ہی ہوتا ہے' پلے سے جاتا کچھ نہیں۔ اللہ کا نام لے کر ایک بار پھر اس کا آغاز کر رہا ہوں۔ قارئین نے اس کی افادیت محسوس کی تو ان شاء اللہ یہ سلسلہ جاری رہے گا..... اقتدار احمد

حالات کے جبر اور "بچے دو ہی اچھے" قسم کے اشتہارات نے ہمارے متوسط طبقے میں اولاد کی تعلیم و تربیت پر توجہ دینے کی ضرورت کا احساس اب خاصا عام کر دیا ہے ورنہ کچھ عرصہ پہلے تک اس خدائی انتظام میں دخل اندازی کا سودا سر میں رکھنے والے لوگ کم کم تھے۔ خود اپنا حال یہ رہا کہ دسمبر ۱۹۵۶ء میں دستورِ زمانہ کے خلاف کم عمری میں ہی شادی کروالینے پر ہر مرتبہ اللہ تعالیٰ کے عمل تخلیق کو ایک دھکا دینے کے بعد فارغ ہوجاتے تھے۔ پھر بس یہ معلوم رہتا کہ بچے ایک دو سے' تین سے چار اور اس سے بڑھ کر پانچ چھ ہوگئے ہیں' ماشاء اللہ۔ اللہ کی اس نیک بندی نے ہی انہیں سنبھالا' پال پوس کر بڑا کیا اور تعلیم و تربیت کی بھی فکر رکھی جس کی قسمت میں میرے گلے کا ہار ہونا لکھا تھا ورنہ میرا تعلق تو اپنے جگر کے ان ٹکڑوں سے بس اتنا تھا کہ اپنی کاروباری مصروفیات سے ذرا فارغ ہوئے اور وہ پہنے اوڑھے نظر آئے تو پیار کرلیا' کچھ دیر کھیل لئے۔ زمان و مکان کے جس دور کا یہ ذکر ہے وہ ساٹھ کی دہائی کا آخری حصہ تھا اور اس میں میرا کاروبار کراچی اور رہائش بھی وہیں کورنگی میں تھی۔ تین بیٹوں میں سے کم سے کم دو اس قابل بھی ہوچکے تھے کہ جب میرا موڈ خراب ہو اور ان سے کوئی شرارت سرزد ہوجائے تو اپنے خوبصورت گال اور نحیف جسم میرے تھپڑوں اور دھول دھپے کے لئے پیش کردیا کریں تاکہ "ابّی" کی بھڑاس نکل جائے۔ وہ معصوم کچھ دیر منہ بسورنے کے بعد سب کچھ بھول بھال کے پھر کھیل کود میں مشغول ہوجاتے۔ بچیاں اس مشقِ ستم سے البتہ محفوظ رہتیں۔

۱۹۷۰ء کی دوسری سہ ماہی میں میں پہلی بار انگلستان کی مختصر سیر کا موقع ملا جہاں سے واپسی پر عمرے کے لئے حرمین شریفین میں قیام کا بھی ارادہ تھا۔ لندن کے عجائب گھر اور چڑیا گھر وغیرہ دیکھتے ہوئے میں نے بڑے استعجاب لیکن حیرت و توجہ سے یہ بات نوٹ کی کہ ننھے منے بچوں کے گروپ جو بالعموم اپنی استانیوں کی معیت میں سیر کے لئے آتے' وہ نہ صرف ادب و آداب بلکہ نظم و ضبط تک کے پابند تھے بلکہ مشاہدے میں آنے والی ہر چیز کو سمجھنے اور تفصیلات جاننے کے لئے بڑی شائستگی سے سوالات بھی کرتے۔ ان گروپوں کا اور اپنے والدین کے ساتھ نظر آنے والے ایک ایک دو دو معصوم بچوں کا طرزِ عمل بھی یہی تھا جن میں سے بعض کے قرب و جوار میں ٹھہر کر میں نے سن گن لی کہ ان کے سوالات معلومات کے پہلے سے موجود ذخیرے سے برآمد ہوتے تھے اور سرسری جوابات سے ان کا منہ بند کرنا ممکن نہ تھا جس کی کوشش بھی کہیں دیکھنے میں نہ آئی۔ ان بچوں کا آئی کیو یعنی ذہانت کا معیار دیکھ کر میں ششدر رہ گیا جبکہ میری سٹی تو وہ "انگریزی" سن کر پہلے ہی گم ہوگئی تھی جو یہ کم سن بچے فرفر بولتے تھے۔ دل ہی دل میں ان کا موازنہ اپنے بچوں سے کیا تو شرم سے پانی پانی ہوگیا۔ مغرب کی ہمہ جہت ترقی کے جو نقوش دماغ نے قبول کئے ان میں سب سے گہرا نقش یہی تھا کہ یہ لوگ اپنی اگلی نسل کی تعلیم و تربیت پر وہ توجہ دے رہے ہیں جس کی طرف ہمارا من حیث القوم کبھی دھیان بھی نہیں گیا۔

بڑے ہی بوجھل دل کے ساتھ واپسی پر جدہ اترا تو جس یار مہرباں کے ہاں قیام ہوا' ان کے پیارے پیارے ہونہار بچے دیکھ کر درد جگر کی کسک میں اور اضافہ ہوا۔ یہ اقبال سہیل تھے ---- اور اب یہ بھی لکھنا پڑ رہا ہے کہ کچھ عرصہ پہلے وہ داغِ مفارقت دے گئے۔ کل من علیہا فان۔ پاکستان میں انہیں پہچاننے والے لاکھوں کی تعداد میں ہیں' جدہ سے مکہ مکرمہ اور وہاں سے طائف منتقل ہوکر سال دو سال پہلے وہیں پیوند خاک ہوگئے ہیں---- میں نے اقبال سہیل کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا جس میں خلش اسی تیر نیم کش کی تھی کہ بچوں کی تعلیم و تربیت کا مطلوبہ معیار یہ ہے جو دیکھ کر آیا ہوں تو ہماری اگلی نسل کا کیا بنے گا؟۔ انہیں ایسا موقع خدا دے' اپنے مخصوص انداز میں مجھ سمیت سب پاکستانیوں کے خوب لتے لئے۔ گفتار کے غازی تھے اور زبان و بیان کی تلوار چلانے پر آتے تو کشتوں کے پشتے لگادیتے۔ ان کی جھڑکیاں اور گھرکیاں بیٹھا سنا کیا اور جب ان کا جوش کم ہونے پر آیا تو اپنا مسئلہ پیش کیا کہ بھلے آدمی' بتاؤ کہ میں خود اپنی اولاد پر جو ستم توڑ چکا ہوں' اس کا ازالہ کیسے کروں۔ اللہ انہیں جزائے خیر دے اور میری سعادت مند اولاد کی بھلائیوں کا مفاد انہیں بھی پہنچے کہ آخر کار انہوں نے ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ خالص عملی مشورے دیئے۔ وللہ الحمد' میں ان سے فیض یاب ہوا ہوں۔

اس سے پہلے کی صورت حال یہ تھی کہ جامعہ اشرفیہ لاہور میں اور پھر اپنے پہلے حج کے موقع پر حرمین میں شیخ عبدالباسط عبدالصمد اور شیخ الشیوخ خلیل حصری سے سماعِ قرآن مجید کے بعد سے میں ان دونوں قاریوں کی تلاوت و ترتیل کے لانگ پلے اور چھوٹے گراموفون ریکارڈوں کا ایک بڑا ذخیرہ جمع کرچکا تھا۔ ٹیپ ریکارڈر اس وقت تک اتنے عام نہ ہوئے تھے لہٰذا سعودی عرب کے دو اسفار میں حاصل کئے گئے اسطوانات (ریکارڈوں) کو ہی جب فرصت ملتی' ریکارڈ پلیئر کے ذریعے اکثر سنتا۔ بڑا بیٹا' عزیزم محمد سعید اسعد اس وقت آٹھ نو سال کا تھا جو خاص سیکھنے کی عمر ہوتی ہے۔ اس میں بھی قرات کا شوق جھلک دکھانے لگا تو پانچویں کے امتحان سے فارغ ہونے پر میں نے اسے تجوید سیکھنے اور تحفیظ قرآن کے نیک کام میں ڈالنے کا فیصلہ کیا۔ سرائیکی علاقے کے ایک نوجوان قاری کی خدمات عزیزی کے لئے مناسب معاوضے اور رہائش کے عوض ہمہ وقتی حاصل کیں جو فن تجوید کے حسن کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ اسعد میاں نے بھی حفظ میں بڑی رفتار اور فن تجوید میں بہت اچھی استعداد کا مظاہرہ کیا۔ بہت مختصر مدت میں وہ سات آٹھ پارے حفظ کرچکے تھے کہ میرے ایک غلط فیصلہ نے سارے کئے کرائے پر پانی پھیر دیا۔

ہوا یوں کہ میں نے کاروباری مصروفیات میں یکسانیت کی بوریت سے اکتا کر ایک نئی ویگن کے ذریعے پورے ملک کی سیر کا پروگرام بنالیا جس کے دوران مختلف مقامات پر پھیلے ہوئے اپنے مختلف کاموں پر کچھ وقت لگانے اور بھائی بہنوں کے پاس چندے قیام کی گنجائش بھی رکھی۔

قاری صاحب کا اصرار تھا کہ آپ مجھے ساتھ لے چلیں تاکہ اسعد میاں سیرو سفر کے مجوزہ مہینہ بھر پر محیط عرصے میں اگر آگے نہ بڑھیں تو کم از کم پچھلا سبق تو نہ بھولیں۔ میری کم بختی کہ ان کا مشورہ قبول نہ کیا..... کہا کہ آپ بھی اپنی بستی میں کچھ وقت لگا آئیں' بچے کو بھی وقفے میں آرام مل جائے گا۔ تب انہوں نے کچھ احتیاطی تدابیر بتائیں جن کے ذریعے نقصان کو کم کیا جاسکتا تھا لیکن سیاحت کے موڈ میں آنے کے بعد ہم والدین نے بھی انہیں نظرانداز کیا' اسعد تو تھا ہی بچہ۔ سیرو سفر سے فارغ ہوکر کراچی واپس پہنچے اور قاری صاحب نے پھر سے سبق دینا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ حفظ کی گاڑی پٹڑی سے اتر چکی ہے۔ اب پچھتائے کیا ہوت۔ پڑوس میں واقع دارالعلوم میں مفتی محمد شفیعؒ سے نیاز مند ہمسایوں کا سا تعلق تھا' ان سے مشورہ کیا تو انہوں نے فرمایا اور اسعد میاں کے استاد نے بھی بے غرضی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس سے اتفاق کیا کہ اب وہ تنہا نہیں چل سکیں گے' طلبہ کی کسی جماعت کے ساتھ بٹھا دیا جائے تو مقصد کا حصول ممکن ہے۔

مفتی صاحب' اللہ ان کے درجات بلند کرے' بڑی دلاویز شخصیت کے مالک تھے۔ ان سے ایک ملاقات مسجد نبویؐ کے صحن میں ہوئی تھی جس کا حال اگلی صحبت میں عرض کروں گا۔ جس فروتنی اور عجزوانکسار کے ساتھ انہوں نے میرے دو سوالوں کے جواب دیئے' وہ ناقابل فراموش ہے۔ ان کے ایک بڑے صاحبزادے محمد رفیع صاحب دارالعلوم کے مدارالمہام تھے اور چھوٹے محمد تقی عثمانی میرے ہم جولی بلکہ شاید کچھ چھوٹے بھی۔ اب تو وہ ماشاء اللہ ملکی سطح پر اعظم رجال میں شامل ہیں اور بین الاسلامی شناخت بھی یقیناً رکھتے ہوں گے' اس زمانے میں حصول علم کے فریضے کی تکمیل میں لگے ہوئے تھے۔ ایک بے تکلف ملاقات میں انہوں نے مجھ سے ایک سودے کی بات بھی کی تھی' انہیں کیا یاد ہوگی۔ کہنے لگے "میں آپ کو عربی سکھا دیتا ہوں' آپ مجھے انگریزی پڑھادیں"۔ میرے پاس ان علمی مشاغلؒ کے لئے وقت کہاں تھا' بات آئی گئی ہوگئی۔ آج ان کے تو علم و فضل کی دھوم ہے اور اپنا حال میں خود ہی جانتا ہوں۔ کہاں راجہ بھوج کہاں گنگوا تیلی ..... خیر' مفتی صاحب نے میری درخواست پر رفیع عثمانی صاحب سے فرمایا کہ مولوی رفیع صاحب! جائیے اقتدار صاحب کو حفظ کی کلاس دکھا دیجئے۔

مولانا رفیع عثمانی کے ساتھ ایک علیحدہ بلاک کی دوسری منزل پر واقع کلاس روم میں پہنچا تو وہاں ذرا سی دیر میں ہی مجھے حتمی ہونے لگی۔ اس بڑی جماعت کے صدفی صد بچے معاشرے کے انتہائی نچلے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ عظیم اکثریت بہتی ناکوں والے بنگالی اور بری بچوں پر مشتمل تھی جن میں سے کئی کے کانوں سے بہتی پیپ پر مکھیاں بھی بھنک رہی تھیں۔ کمرے میں بلا کا تعفن تھا جسے چھت کا واحد پنکھا نفاہیں بڑی خوبی کے ساتھ یکساں گھول رہا تھا۔ میں الٹے پیروں واپس آگیا اور مفتی صاحب سے عرض کیا کہ حضرت' ان بچوں میں سے ذہین تر اور نسبتاً مرفہ الحال طلبہ کی ایک الگ کلاس بنا لیجئے جس میں میرا بچہ بھی شامل ہوجائے تو اس پورے اضافی خرچ کا ذمہ لیتا ہوں۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ یہ تو بہت اچھی تجویز ہے' جماعت چھوٹی ہوگی تو سبھی اچھے بچوں کا بھلا ہوگا۔ ٹھیک ہے' ہم کوئی اچھا استاد تلاش کئے لیتے ہیں۔ آپ چند دنوں بعد پتہ کر لیجئے گا.....○○ (جاری ہے.....)

بقیہ: تجزیہ

بھارت کے لئے ان پابندیوں کا مقابلہ ہمارے مقابلہ میں کم مشکل ہے مگر وہ مقابلہ کی ہمت رکھتا ہے اور ہم بھی رکھتے ہیں مگر اس طرح کیا ایک نہ ایک دن بھارت اور پاکستان میں ایٹمی تصادم نہیں ہوجائے گا اور کیا یہ تصادم ان ملکوں کے حق میں ہے؟ ظاہر ہے کہ نہیں۔ مگر کوئی بھی حکومت ایٹمی دستبرداری پر تیار نہیں اور نہیں ہوگی تاوقتیکہ برصغیر میں دانشورانہ سطح پر ذہنی انقلاب برپا کرنے کے لئے تحریکیں نہ ہوں جو عناد کی جگہ بھائی چارے کا ماحول پیدا کرنے کے لئے کام کریں۔ اس میں پاکستان بھارت' بھارت کے مسلمانوں اور سارے علاقے کا فائدہ ہے کہ ہتھیاروں کی دوڑ اور ہتھیاروں کی دہشت ختم ہو۔ امریکہ اپنے دباؤ کے ذریعہ ہماری اس جنگ پسندی کو ختم نہیں کرسکے گا جو برصغیر کی سیاست کے غلط ہوجانے کے نتیجے میں ہماری ذہنیتوں کی جڑوں میں سرایت کر چکی ہے۔ اس کے لئے برصغیر کے اندر سے امن و مفاہمت کی تحریکیں چاہئیں مگر یہ تحریکیں کون چلا سکتا ہے' ترقی پسند حضرات اور اسلامی نقطہ نظر کے علمبردار دونوں اس کی ذمہ داری لینے کے لئے تیار نہیں ہیں اور مقتدر طبقہ تصادم کی راہ پر بڑھتا جا رہا ہے امریکہ اس تصادم کو روک نہیں سکے گا اور جب یہ ہوگا تو ہم دو تین سو سال پیچھے چلے جائیں گے اور یہ بھی امکان ہے کہ بالکل ٹوٹ پھوٹ کر رہ جائیں۔

یہ ایسا فلسفہ ہے جس پر ہمارے دانشوروں کو بھی توجہ دینی چاہئے اور بھارت پہنچ کر بھارتی دانشوروں کو بھی اس جانب متوجہ کرنا چاہئے کہ وہ برصغیر کو موت کے کنویں سے نکالنے کے لئے کچھ کریں۔ اس سلسلہ میں اگر پاکستان کے مذہبی رہنما امن اور مفاہمت کے مشن کے لئے بھارت کا دورہ کریں تو اس تاثر کی تردید ہوسکے گی کہ جو اسلام کا نام لیتا ہے' وہ جنگ پسند ہے اور امن و مفاہمت اسے منظور نہیں۔ سیاسی اور فوجی رہنما جو مناسب سمجھیں کریں مگر محب انسانیت دانشوروں اور نظریاتی لوگوں کو احساس کرنا چاہئے کہ برصغیر کو انسانیت کا مقتل بنانے سے بچانے کے لئے انہیں اپنی ذمہ داری ادا کرنی ہے ورنہ پاک بھارت عناد کا پارہ یونہی اوپر چڑھتا رہا تو امریکہ یا دنیا کی کوئی کوشش ہمیں جنگ کے شعلوں میں خاکستر ہونے سے بچا نہیں سکے گی۔ دفاع کی تیاریوں کا ہر ملک کے سیاست دانوں اور فوجیوں کو حق ہے' وہ اپنا یہ حق استعمال کر رہے ہیں مگر ایک حق اہل دانش اور دعوتی گروپوں کا بھی ہے کہ عصبیتوں کا توڑ کریں اور امن و مفاہمت کا ایسا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کریں جس میں دانش اور ضمیر کی آواز صاف سنی جاسکے اور ہمارا المیہ یہ ہے کہ ایسی کوشش کرنے والوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے.....○○

بقیہ: گورنر سندھ کا مرثیہ

حاکم آج بھی موجود ہیں۔ یہ صریحاً ظلم ہے۔ اس ظلم کو اب ختم ہونا چاہئے۔ اب پاکستان میں تعلیم کو اولیت دینی ہوگی اور ہر نونہال کو تعلیم دینی ہوگی اور ہر نوجوان کو تعلیم و تربیت سے مرصع کرنا ہوگا۔ پاکستان میں خواتین کی بیداری ہی تعمیر و ترقی کا عنوان بن سکتی ہے۔ زندگی کے ہر میدان میں پورے وقار اسلامی کے ساتھ خواتین کو برسر عمل ہونا چاہئے۔ ہر وہ حق کہ جو اسلام خواتین کو دیتا ہے اس سے خواتین کو اب محروم نہیں کیا جاسکتا۔ علوئے فکر کے ساتھ اس راہ میں اقدامات ناگزیر ضرورت ہیں۔○○

سہ روزہ علاقائی اجتماع

تنظیم اسلامی حلقہ پنجاب شرقی

جمعہ ۲۹ اپریل تا اتوار یکم مئی ۹۴ء

قرآن آڈیٹوریم ۱۹۱۔ اے ترک بلاک' نیو گارڈن ٹاؤن' لاہور

بقیہ: قادیانی

کے تحت قادیانیوں کو کلیدی عہدوں پر بٹھا دیا گیا تھا۔ ان میں جی احمد' چوہدری ظفراللہ' ایم ایم احمد اور عزیز احمد نے کن کن طریقوں سے اپنے غیر ملکی آقاؤں کی فرمانبرداری میں پاکستان کو نقصان پہنچایا' یہ حقائق کبھی پوری طرح سامنے نہیں لائے گئے۔ حال ہی میں اسحاق خان' نواز شریف جھگڑے میں بھی کہا جاتا ہے کہ کہ ایم ایم احمد اور ان کے معاون رفیع رضا کا ہاتھ تھا۔

قادیانیوں کے آئندہ عزائم کے بارے میں ٹھیک سے کوئی اندازہ قائم کرنا مشکل ہو گا لیکن ایک بات یقینی ہے اور وہ یہ کہ ان کی کوشش ہوگی کہ اگلی پاک بھارت جنگ جلد برپا ہو۔ اس کے لئے ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگوں کی طرح قادیانیوں نے ابھی سے کلیدی عہدوں میں گھسنا شروع کر دیا ہے۔ ظاہر ہے گزشتہ جنگوں کی طرح اس جنگ کا نقشہ بھی پہلے سے تیار کر لیا جائے گا لہٰذا ہمیں ابھی سے ایسا لائحہ عمل طے کرنا چاہئے کہ دشمن کی چالوں میں آ کر نقصان اٹھانے سے زیادہ سے زیادہ بچ سکیں۔ اس ضمن میں جہاں قادیانیوں پر کڑی نظر رکھنے کی ضرورت ہے' وہاں یہ بھی ہونا چاہئے کہ اعلیٰ سول اور فوجی عہدوں پر فائز قادیانی حضرات سے ممتاز دینی شخصیات کی ملاقاتیں ہوں اور انہیں حقائق بتائے جائیں۔ ممکن ہے جو لوگ ایسے ہی نیم دلانہ طور پر قادیانیت کے ساتھ اپنی وابستگی برقرار رکھے ہوئے ہیں' وہ اپنی اصطلاح پر آمادہ ہو جائیں۔ باقی جو قادیانی جان بوجھ کر پاکستان اور اسلام دشمن سرگرمیوں میں ملوث ہیں ان کے بارے میں اس لئے سنجیدگی کے ساتھ غور نہیں کیا جاتا کہ ایک تو وہ خود اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوتے ہیں' دوسرے یہ بھی ایک اہم وجہ ہے کہ اعلیٰ سطح پر ہمارے پڑھے لکھے طبقہ میں اس کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے کہ کون کتنا مسلمان ہے اور مسلمان ہے بھی یا نہیں!۔

بہرحال اگر ہمیں ملک اور قوم کی سلامتی عزیز ہے تو فوری طور پر ایک بااختیار کمیٹی تشکیل دینی چاہئے جو قادیانیوں کے یہودیوں کے ساتھ گٹھ جوڑ اور عزائم کا جائزہ لے کر حکومت کو رپورٹ پیش کرے اور اس کی روشنی میں مناسب تدابیر اختیار کی جائیں۔

○

(بشکریہ گلوبل گیم ایکسپوژر سنٹر' لاہور)

تحریکِ خلافت پاکستان

کے اساسی مقاصد

○

(۱) نبی اکرم ﷺ کی واضح پیشینگوئیوں کے مطابق پورے کرۂ ارض پر نظام خلافت کے قیام کی راہ ہموار کرنا۔

(۲) نظامِ خلافت کی برکات سے پاکستان اور تمام دنیا کے مسلم و غیر مسلم افراد کو متعارف کروانا۔

(۳) رائج الوقت غیر فطری' ظالمانہ اور استحصالی نظاموں کی گمراہیوں اور خرابیوں سے لوگوں کو آگاہ کرنا۔

(۴) مسلمانانِ عالم میں دین کے تقاضوں کا شعور پیدا کرنا۔

(۵) ابتدائی مرحلہ کے طور پر پاکستان کے عوام کو ایسا پلیٹ فارم مہیا کرنا جہاں سے مذہبی فرقہ واریت اور انتخابی سیاست سے بالاتر ہو کر نظامِ خلافت کے قیام کے لئے منظّم جدوجہد کی ضرورت کا شعور پیدا کیا جا سکے۔

WEEKLY "NIDA-E-KHILAFAT" LAHORE
36-K, Model Town Lahore- 54700 Regd:No L. 9184

پاکستان میں قادیانیوں کی ریشہ دوانیاں

—— اخذ و ترجمہ: سردار اعوان

یہ بات کسی تعجب کا باعث نہیں ہونی چاہئے کہ دروزیوں' اسماعیلیوں اور بہائیوں کی طرح قادیانی بھی بین الاقوامی صیہونیت کے ادارے "زائنسٹ انٹرنیشنل جیوری (زنجری) کی پیداوار ہیں اور ان کا آپس کا گٹھ جوڑ بالکل فطری ہے۔ پاکستانی قادیانیوں میں چاہے اقلیت میں سہی' ایسے لوگ بھی موجود ہیں جن کا قادیانیت یا مرزا غلام احمد پر کوئی یقین نہیں۔ مگر اس کے باوجود وہ سماجی اور معاشی جکڑ بندیوں کے سبب قادیانیت کے دامن میں پناہ لئے رکھنے پر مجبور ہیں۔ ان لوگوں کی اکثریت جو خلوص کے ساتھ قادیانیت کے ساتھ ہیں' عین ممکن ہے کہ قادیانی قیادت کے اصل عزائم سے واقف نہ ہو۔ مگر واقعہ بہرحال یہ ہے کہ کوئی بھی قادیانی اپنے نظم سے باہر نہیں جا سکتا چاہے اس کی حیثیت کچھ بھی ہو۔

حال ہی میں اعلیٰ قادیانی قیادت نے پاکستان میں اپنی سرگرمیاں تیز کر دی ہیں۔ ان دنوں پاکستان میں قرآن مجید اور خود حضرت محمدؐ کی شان میں گستاخی کے کئی واقعات منظر عام پر آئے ہیں جن میں یا تو براہ راست کوئی قادیانی ملوث تھا یا پس پردہ قادیانی تھے۔ بعض سنگین واقعات ایسے بھی ہیں جو کوشش کے باوجود پولیس میں درج نہیں ہو سکے۔ اب قادیانیوں کو اپنے مکانوں پر ڈش انٹینا لگانے اور لندن سے نشر ہونے والے مرزا طاہر احمد کے خطابات باقاعدگی سے سننے کی ہدایات جاری کی گئی ہیں اور اپنی شناخت عام کرنے کے علاوہ اپنی اولاد کو قادیانیت کے لئے وقف کرنے' خود مختار کشمیر کے حق میں دلائل فراہم کرنے اور پاکستان میں امریکی لابی کے حق میں اپنا وزن ڈالنے کی تاکید کی گئی ہے۔ دیکھا جائے تو یہ سبھی باتیں ایسی ہیں جو حالیہ عالمی صیہونی حکمت عملی کے ساتھ مطابقت رکھتی ہیں۔

پاکستان میں بدقسمتی سے قادیانیوں کی اسلام اور پاکستان دشمن سرگرمیوں کا کبھی بھی سنجیدگی سے جائزہ نہیں لیا گیا۔ قیام پاکستان کے ساتھ ہی ایک سازش

(باقی اندرونی سرورق کے دوسری جانب)

سالانہ کنونشن

تحریکِ خلافت پاکستان

تحریکِ خلافت پاکستان کا سالانہ
کنونشن ان شاء اللہ العزیز
۳۰ اپریل بروز ہفتہ صبح ۹ بجے
قرآن آڈیٹوریم' اتاترک بلاک نیو گارڈن ٹاؤن' لاہور
میں منعقد ہو گا۔ تمام معاونینِ تحریک خلافت نوٹ
فرمالیں اور شرکت کو یقینی بنانے کے لئے ضروری
انتظام فرمائیں۔

سیکریٹری تحریک

جلسہ خلافت

لیاقت باغ - راولپنڈی

۸ اپریل ۹۴ء بروز جمعہ صبح ۱۱ بجے
مقررین:- میجر جنرل ریٹائرڈ ایم ایچ انصاری'
ناظم اعلیٰ تحریک خلافت پاکستان
چوہدری رحمت اللہ بٹر
خصوصی خطاب: محترم ڈاکٹر اسرار احمد
امیر تنظیم اسلامی و داعیٔ تحریک خلافت پاکستان